۱۹۷۵ء میں غامدی صاحب نے قرآن کا چیلنج قبول فرمالیا تھا

سیالکوٹ میں غامدی نے خود ساختہ ۴۰ آیات پیش فرمائیں

عربی زبان ولغت کے سب سے بڑے عالم: جاوید غامدی

سیالکوٹ میں علامہ ساجد میر کے بھانجے مستنصر میر کے توسط سے جاوید غامدی صاحب کا ایک حلقہ احباب ایام جوانی میں قائم ہوگیا تھا جہاں غامدی صاحب کی عربی دانی کے چرچے تھے غامدی صاحب اکثر و بیشتر سیالکوٹ تشریف لاتے اور سبعہ معلقہ، کلام عرب، قرآن حکیم پر اپنے ارشادات سے محافل کو گرماتے تھے عربیت کا ذوق وشوق اس زمانے میں نکتہ عروج پر تھا اور سرور کی ایک کیفیت نے ان کا احاطہ کر رکھا تھا اس دور میں غامدی صاحب اپنے آپ کو سُوق عکاظ کا سب سے بڑا شاعر خطیب، ادیب داستان گو اور محفل آراء سمجھتے تھے۔ بسا اوقات وہ لبید، امرؤالقیس، اعشیٰ، حارث بن حلزہ، قس بن ساعدہ، زہیر، عمرو بن کلثوم، نابغہ، طرفہ، عنترہ کی عربی دانی کو ہیچ قرار دیتے اور کلام عرب میں وہ نقائص دکھاتے جو ہم متبدیوں کے لیے طلسم خانہ حیرت کے در کھول کر رکھ دیتے کیوں کہ اس حلقہ میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو غامدی صاحب کے دعاوی کا ناقدانہ جائزہ لینے کی اہلیت رکھتا وہ گفتگو کرتے تو اصمعیات، سبع معلقات، البیان والتبیین، الکامل فی اللغۃ والادب، جمہرۃ اشعار العرب، مختارات شعراء العرب، الفحول، دیوان المعانی، مفضلیات اور حماسہ میں عیب دکھا دیتے۔ لغت عرب کی امہات کتب التہذیب، المحکم الصحاح اور الجمہرہ کے ورق ورق کو تار تار فرما دیتے کلام منحول پر وہ خطبات دیتے کہ سننے والا ششدر رہ جاتا اور غامدی صاحب کے سحر میں گرفتار ہو جاتا۔ غامدی صاحب پر عربی کا جنون سوار تھا وہ جاحظ، ابن قتیبہ، ابوالفرج، ابن عبدربہ، ابوحیان التوحیدی، امام شافعی، القیشری، ابن جوزی، امام غزالی کی عربی میں سینکڑوں نقائص نکال دیتے تھے۔ تکبر علمی کے اسی زمانے میں حضرت والا نے قرآن کے اس دعوے کا ''ایک آیت اس کی مثل بنالاؤ'' کا جواب دینے کے لیے چالیس آیات تصنیف فرمائیں اور سیالکوٹ میں ایک نشست میں یہ سورتیں سنائیں۔ یہ نشست کہاں ہوئی اس کی بھی کچھ دلچسپ اور لذیذ تفصیل سنیے:

علامہ ساجد میر کا خاندان اور غامدی صاحب:

۱۹۷۵ء میں جناب غامدی صاحب ممتاز اہل حدیث عالم علامہ ساجد میر کے بھانجے ڈاکٹر مستنصر میر کی دعوت پر سیالکوٹ تشریف لائے، کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک ممتاز راسخ العقیدہ گھرانے کا ہونہار فرزند غامدی صاحب جیسے جاہل، عربی زبان سے ناواقف، دینی علوم اور مغربی علوم سے لاتعلق لاعلم فرد کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سہیل طفیل نشتر میڈیکل کالج میں سال دوم کے طالب علم تھے [ڈاکٹر صاحب مستنصر میر کے خالہ زاد بھائی اور علامہ ساجد میر کے بھانجے جواب ممتاز ماہر قلب بھی ہیں]، اور جس گھر میں رہتے تھے۔ اس گھر کے بالکل سامنے ایک چھوٹی سی گلی میں میر خاندان کا ایک آبائی مکان جس کا نمبر ۶۹۴/۳۱ جو آج بھی موجود ہے اور جناب عبدالوکیل میر صاحب یہاں قیام پذیر ہیں۔ اس وقت اس گھر کے مالک عبدالرؤف میر تھے، جناب غامدی صاحب کی میزبانی کی سعادت اس مکان کو حاصل ہوئی۔ اسی مکان میں جناب غامدی صاحب نے قرآن کی وہ چالیس آیات پیش فرمائیں جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ یہ قرآن کے چیلنج کا جواب ہے۔ مولانا میر ابراہیم سیالکوٹیؒ جو رشتے میں علامہ ساجد میر صاحب کے رشتے کے نانا ہیں سیالکوٹ میں ان کی مسجد، مسجد ابراہیمی میں غامدی صاحب نے سورہ عصر کا درس بھی دیا تھا۔ چالیس آیات شیطانی کی مجلس میں راقم بھی حاضر تھا اس کے علاوہ اسد صدیقی، ڈاکٹر سہیل طفیل برادر مستنصر میر، ڈاکٹر مستنصر میر، ڈاکٹر منصور الحمید، اسد صدیقی اور دیگر رفقائے خاص اس موقع پر موجود تھے۔ غامدی صاحب نے بعد ازاں یہ آیتیں کتابی شکل میں اشاعت کے لیے منڈی مرید کے ایک کاتب سے کتابت بھی کرائی تھیں لیکن کتابت بہت ناقص تھی لہٰذا مسودہ روک دیا گیا۔ دریں اثناء ڈاکٹر مستنصر میر کی زجر و توبیخ کے باعث غامدی صاحب نے توبہ کر لی اور ان کی توبہ ان کے اس حلقہ مریدین نے قبول بھی کر لی لہٰذا مسودہ ضائع کر دیا گیا۔ راقم کے پاس مسودے کا ایک ٹکڑا محفوظ رہ گیا تھا لہٰذا اس ٹکڑے سے چند آیات کی نقل من و عن حاضر ہے ترجمہ غامدی صاحب کے قلم سے ہے۔

غامدی کی عربی آیات بمقابلہ قرآن:

أقسم بخالق الخيل، والريح الهابة بليل، بين الشرط ومطالع سهيل، آن الكافر لطويل الويل، وإن العمر لمكفوف الذيل، اتق مدارج السيل، وطالع التوبة من قبيل، تنج وما إخالك بناج۔

میں اُس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو گھوڑوں کا خالق ہے اور جو رات کو ستارۂ شرط اور سہیل کے طلوع کے بائیں ہوا چلاتا ہے کہ کافر بڑے عذاب میں مبتلا ہے اور کہ عمر کا دامن بندھا ہوا ہے تو سیلاب کے گذرگاہ سے بچ اور پہلے ہی سے توبہ کر لے کہ تو نجات پا جائے گا مگر مجھے توقع نہیں کہ تو ایسا کرے۔

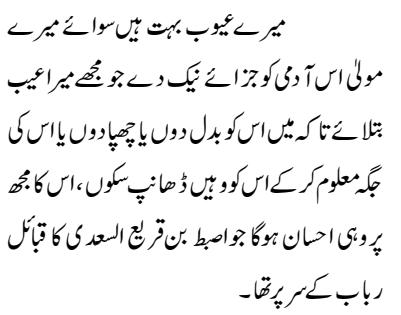

[illegible] ... [illegible]
... على عيبي، إما غيرته
وإما سترته، أو عرفت مكانه فاغتفرته
لقد منّ على ذا الكرم منته الأخبط
على الرباب،

میرے عیوب بہت ہیں سوائے میرے مولیٰ اس آدمی کو جزائے نیک دے جو مجھے میرا عیب بتلائے تاکہ میں اس کو بدل دوں یا چھپا دوں یا اس کی جگہ معلوم کر کے اس کو وہیں ڈھانپ سکوں، اس کا مجھ پر وہی احسان ہوگا جو اصبط بن قریع السعدی کا قبائل رباب کے سر پر تھا۔

ابوالعلاء کا معارضۂ قرآن: مسمی الفضول

سیالکوٹ میں قرآن کے مقابلہ پر آیات قرآنی پیش کر کے بعد اسی موقع پر غامدی صاحب نے ابو العُلاء معری کے معارضۂ قرآن کا تعارف بھی کرایا اور بتایا کہ ان کا معارضہ معریؒ کے مقابلہ میں نہایت اعلیٰ درجے کا ہے ابوالعلاء کی کتاب مسمی الفصول والغایات [فی محاذاۃ السور والآیات] کا واحد مخطوطہ ان کے دعوے کے مطابق دنیا میں صرف انہی کے پاس تھا جس کے بارے میں ناصر خسرو علوی اور باخرزی صاحب دمیۃ القصر کی شہادت تاریخ میں محفوظ ہے۔ غامدی صاحب کے مطابق ابوالعلاء سے کسی نے کہا کہ ''تم نے کتاب تو خوب لکھی ہے مگر اس پر قرآن کی سی رونق کہاں''، اس پر اس نے جواب دیا کہ جب اس کو بھی چار سو سال تک محرابوں میں رٹو گے تو وہ جلاء پا جائے گی۔ جب ان سے حوالہ پوچھا گیا تو فرمایا الصبح المبنی ۱،۳۲ و ذہبی وغیرہ دیکھ لو۔

حقیقت یہ ہے کہ آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس نے بچشم خود ابوالعلاء کی یہ کتاب دیکھی ہے، بلکہ ایک کتاب میں تو یہ دعوی ہے کہ یہ ابوالعلاء پر محض اتہام ہے۔ لیکن غامدی صاحب جس طرح ہر معاملے میں تفرد فرماتے ہیں یہاں بھی سب سے مختلف ہیں۔

معجم الادباء اور ابوالعلاء کی کتاب:

ایک اور روایت کے مطابق جو ضعیف ہے یاقوت نے معجم الادباء [۶×۲۳۵] میں اس کتاب کے دھلوانے کا ذکر کیا ہے اور بغداد کے کتب خانہ دارالکتب المامونیہ کے استاد ابن الدیان کا حوالہ دیا ہے اور کتاب کا نام ''نقص القرآن'' بتایا ہے۔ ابوالمعالی نے اس کتاب کو دھلوانے پر سخت ناراضگی ظاہر کی اور کہا کہ اسے سنبھال کر رکھتے تاکہ اعجاز قرآن پر دلیل ہوتی۔ محبّ الدین الخطیب نے حجاز سے ابوالعلاء کی کتاب کا ایک جزء حاصل کیا تھا یہ جزء ''اقلید الغایات'' کے ساتھ محفوظ تھا۔

صاحب کشاف کا ابوالعلاء پر نقد:

امام فخر الدین نے صاحب کشاف زمخشری کی جانب سے ابوالعلاء کی مشکوک کتاب پر ابوالعلاء کے خلاف لکھی گئی ان کی قدح [برکشاف ۳×۲۴۴، مطبوعہ مصر ۱۳۱۹ء] کو نامناسب قرار دیا ہے۔ واضح رہے کہ زمخشری

کم عمری میں سقط الزند کے حافظ بن گئے تھے۔لہٰذا اپنے محسن پر یہ اعتراض بلاتحقیق امام فخر الدین کو پسند نہ تھا۔ابو العلاء پر ''اخبار ابی العلاء و مالہ و ماعلیہ'' کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے اسرار و رموز کھل جائیں گے۔نقص قرآن یا مسمی الفصول کی نسبت ابو العلاء سے ایسی ہے جیسے حمید الدین فراہی سے جاوید احمد غامدی کی نسبت نہ وہ نسبت درست تھی نہ یہ نسبت درست ہے۔ یہ چند اہم گزارشات قارئین ساحل کی خدمت میں پیش کر دی ہیں جو گم شدہ تاریخ کا فراموش شدہ ورق ہے اگر کوئی خامی، عیب، نقص ہو تو بلاتکلف نقد فرمایے کیونکہ راقم حضرت عمر کے اس قول کو آب زر سے لکھنے کے قابل سمجھتا ہے۔

رحم الله من اهدی الیّ عیوبی

اللہ اس بھلے مانس کا بھلا کرے جو میرے پاس میرے عیوب کا تحفہ لائے۔

[ایک واقف راز خاکسار]

غامدی صاحب کے حلقے کے بارے میں چند تجربات و مشاہدات پیش کرتا ہوں پہلی بات تو یہ کہ غامدی صاحب کا فراہی صاحب سے کیا تعلق وہ پابند شرع یہ شرع سے آزاد، وہ ٹوپی داڑھی اور پائنچے تک اوپر رکھنے کا اہتمام کرنے والے یہ ان سنتوں سے معریٰ فراہی صاحب نے تو امین احسن کے پائینچے قینچی سے کاٹ دیتے تھے کسی کے ایمان کا اندازہ فراہی صاحب داڑھی کی لمبائی سے کرتے تھے اور داڑھی کو ایمان و کفر کا پیمانہ قرار دیتے تھے۔داڑھی منڈوں کے سلام کا جواب نہ دیتے تھے۔ان سے ہاتھ تک نہ ملاتے سب کے سامنے ان کی بے عزتی کرتے اور کہتے کہ قیامت سے ڈرو جب سب کے سامنے ذلیل ہونا پڑے گا۔اس سلسلے میں ذکر فراہی کا ص ۵۲۶، ۸۴۴، ۸۴۵ ملاحظہ فرمایے۔ وہ سنت کی جو تعریف متعین کرتے تھے وہ سلف سے ماخوذ تھی غامدی صاحب کی سنت خود ساختہ ہے۔غامدی صاحب پہلے فراہی صاحب کے اصول دین مانتے تھے۔داڑھی کو سنت تسلیم کرتے تھے، پھر گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹاور پر حملے کے بعد داڑھی فطرت ہوگئی اب صرف اچھی چیز ہے، دین کا اس سے تعلق نہیں فراہی صاحب ٹوپی پہنتے تھے۔غامدی صاحب نہ صرف اپنی ٹوپی اتارتے ہیں بلکہ امت کے تمام اکابرین کی ٹوپیاں اتارنے کا کام کر رہے ہیں، ان کے حلقے میں ہر شخص ٹوپی سے نفرت کرتا ہے لیکن جب ان کے حلقے میں رمضان میں سدا بہار کلب بہادر آباد کراچی میں تراویح کو بدعت کہنے کے باوجود کراچی کے سرمایہ داروں اور خصوصاً دہلی برادری کے سرمایہ دار اور تبت گروپ کے سعید اللہ والا کی خواہش کو پیش نظر رکھ کر غامدی صاحب کے جانشین عامر گزدر سعید اللہ والا کے سدا بہار کلب میں تراویح پڑھاتے ہیں تو سر پر ٹوپی بھی رکھ لیتے ہیں تاکہ المورد کو مال مہیا کرنے والے امراء ناراض نہ ہوں۔ایک مرتبہ کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو سدا بہار میں تراویح کی بدعت زیر امامت حلقہ غامدی میں شرکت کا موقع ملا، سدا بہار میں تراویح کا منظر بھی ایک عجیب منظر تھا۔کراچی کے ارب پتی کھرب پتی لوگ ترجمہ و تشریح سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں، کرسیاں صوفے رکھے ہوئے ہیں جہاں بہت سے سرمایہ دار پیر پھیلا کر بیٹھے ہوئے ہیں

کچھ کھا رہے ہیں موبائل فون چلا رہے ہیں باتیں کر رہے ہیں فون پر بازار کی باتیں کر رہے ہیں کبھی کبھی ترجمہ بھی سن لیتے ہیں کچھ تدبر قرآن کر رہے ہیں تراویح نہیں پڑھ رہے ایک جگہ اسٹال لگا ہے لوگ تراویح کے دوران وہاں سے کتابیں لے کر پڑھ رہے ہیں، جائے نمازوں پر اکثر لوگ آرام دہ کرسی رکھ کر ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے اور کعبہ کی طرف پاؤں پسار کر بیٹھے رہتے ہیں، اسی سمت ملٹی میڈیا کے ذریعے قرآن کی آیت پردے پر پیش کی جاتی ہیں، ان آیات کا بھی احترام نہیں ہوتا، چار رکعتوں کے بعد وقفہ برائے چائے ہوتا ہے، چائے کے ساتھ بسکٹ پیش کیے جاتے ہیں اور بسکٹ ہاتھوں میں دیے جاتے ہیں، چائے اور بسکٹ کے حصول کے لیے بھگدڑ مچ جاتی ہے، چائے لینے والے مٹھی میں بسکٹ دبا کر جائے نمازوں پر رکھ دیتے ہیں وہیں سے اٹھا کر کھاتے ہیں جہاں پیر رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے پھر وہیں ہاتھ صاف کر کے تراویح کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں یہ اس شہر کے مہذب، ارب پتی، باعزت لوگوں کے ساتھ دانش سرا والوں کا سلوک ہے کہ معززین شہر کو فقیروں کی طرح بسکٹ اور چائے پیش کی جاتی ہے، بزرگوں کی عزت کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ انھیں چائے ان کی نشست پر فراہم کی جائے۔ گزشتہ سے پیوستہ سال تراویح میں وقفے کے دوران شکیل الرحمان صاحب نے زلزلے کے اسباب پر غامدی صاحب سے گفتگو کے لیے محفل تراویح سے ان کے گھر پر فون ملایا، لطف یہ کہ غامدی صاحب کے پروردگار سرمایہ دار کراچی میں بدعت کا ارتکاب کر کے تراویح پڑھ رہے ہیں اور ان کے روحانی پیشوا غامدی صاحب گھر میں آرام فرما رہے تھے۔ بیگم صاحبہ نے فون اٹھایا آواز محفل تراویح میں آئی کون کیا کام ہے، پانچ منٹ بعد غامدی صاحب اس محفل بدعت سے خطاب کرنے تشریف لے آئے، جدیدیت پسند اسلام اسی کا نام ہے کہ دین تزکیہ، تصفیہ، حضوری قلب نہیں میلا ٹھیلا، چوپال، محفل اور خورد ونوش کے دھندے کا نام ہے۔ سدا بہار میں تراویح کے اہتمام کی کیا ضرورت ہے جب کہ غامدی صاحب اسے بدعت کہہ چکے ہیں اور خود تراویح نہیں پڑھتے بلکہ ان کا فتویٰ ہے کہ تراویح تہجد کے وقت پڑھی جائے اور کسی ایک مقررہ وقت نہیں تو پھر صرف سعید اللہ والا اور کراچی کے چند سرمایہ داروں کی خوشنودی کے لئے دانش سرا کے زیر اہتمام بدعت کا ارتکاب کیوں؟ صرف اس لئے کہ المورد کی مالی امداد جاری رہے اس محفل تراویح میں بڑے بڑے امراء کو چائے اور بسکٹ جس طرح دیے جاتے ہیں اس کا اخلاقی جواز کیا ہے؟ تراویح کی جاء نمازوں پر بسکٹ رکھ کر کھانا وہیں ہاتھ پونچھنا وہیں ہاتھ جھاڑ کر نماز کے لئے کھڑے ہونا کون سی سنت ہے؟ نمازیوں کو سدا بہار والے کم از کم رکابی، طشتری اور کاغذی رومال یا ٹشو پیپر مہیا کر سکتے ہیں لیکن یہ بھی مہیا نہیں کیا جاتا یہ کون سے اخلاق ہیں کون سی تہذیب ہے کس قسم کے ادب آداب ہیں یہ کیسی نفاست ہے تراویح اور ترجمے کے دوران قبلہ رخ ہو کر پیر پھیلانا، آرام سے لیٹ کر قرآن سننا کیا یہ بدعت حسنہ ہے غامدی صاحب کبھی ان امور پر فتویٰ نہیں دیتے اس لئے کہ شکیل الرحمان نے جن لوگوں کو جمع کیا ہے ناراض نہ ہو جائیں یہ دین ہے۔

فراہی، اصلاحی، غامدی مکتب فکر جدید مغربی فلسفے وسائنس کے مباحث سے ناواقف

غامدی صاحب کی تحریروں میں مغربی فلسفہ کا صرف ایک غلط حوالہ

نطشے کے تتبع میں فلسفہ پر کتاب:

غامدی صاحب کے احباب ورفقاء اس بات کا اظہار بڑی شدت سے کرتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے منتہی تھے اور مغربی فکر وفلسفے پر عبور رکھتے ہیں۔ ایام طالب علمی میں انہوں نے نطشے کے تتبع میں اسی انداز پر انگریزی میں ایک فلسفیانہ کتاب نطشے کے منہاج کے مطابق تحریر فرمائی لیکن اس کتاب کی نقل کوئی مہیا نہیں کرتا غامدی صاحب کے رفقاء کے اس دعوے کی تحقیقات کے لئے ساحل نے اشراق کے تیس سالہ رسالے اور غامدی صاحب کی ۳۰۰ تقاریر کا مطالعہ اور معائنہ کیا تو یہ دعویٰ بے بنیاد نظر آیا۔

جاوید غامدی کا نثری سرمایہ نوسو صفحات: عمر ساٹھ سال

واضح رہے کہ جاوید غامدی نے ۶۰ سال کی عمر میں کتابی شکل میں نثر میں صرف نوسو صفحات تحریر فرمائے ہیں۔ [برہان ۳۰۵ صفحات + مقامات ۱۸۲ صفحات + میزان ۳۳۷ صفحات + البیان ترجمہ ۷۶ صفحات] اشراق ۱۹۷۸ تا ۲۰۰۷ء میں ان کے کچھ مقالات وتقاریر شائع ہوئے ہیں ان تمام تحریروں میں کسی مغربی فلسفی ومفکر کا حوالہ نہیں ملتا صرف جنوری ۱۹۷۸ء کے اشراق میں مجوزہ اکادمی کے نصاب کے حوالے سے غامدی صاحب نے خیال وخامہ کے عنوان سے ۸ صفحات کا اداریہ لکھا تھا جس میں کانٹ ہیگل سارتر بلنچلی وغیرہ کا سرسری ذکر کیا گیا تھا لیکن غامدی صاحب نے یہ اداریہ ''مقامات'' میں ''نیا فتنہ'' کے نام سے شائع کیا تو آٹھ صفحات میں سے چھ صفحات حذف فرمادیے اور جو دو صفحات شامل کئے ہیں ان میں مغربی فلسفے سے متعلق تمام سطور خارج کردی گئیں۔ یعنی وہ اپنے سابقہ موقف سے دستبردار ہوگئے۔

اردو المورد ویب سائٹ: فلسفہ پر صرف ایک مضمون

جناب غامدی صاحب کے ادارہ المورد کی ویب سائٹ http://urdu.al-mawrid.org سے

دو مئی ۲۰۰۷ء کو فلسفے کے موضوع پر موجود مضامین و مباحث کا مطالعہ کیا گیا تو فلسفہ سے متعلق غامدی صاحب کا صرف ایک مضمون حق و باطل کے نام سے موجود تھا۔ یہ مضمون بھی ۱۹۸۸ء کا تھا اور اشراق میں شائع ہو چکا ہے۔ یہی مضمون ''مقامات'' میں اسی نام سے موجود ہے۔ ہم نے اشراق، المورد، غامدی اور دیگر ویب سائٹ پر فلسفے سے متعلق غامدی صاحب کے مکتبہ فکر کے موتی تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر تلاش ناکامی کا پیغام لائی۔ مغربی فکر و فلسفے پر غامدی مکتب فکر کا کوئی کام نہیں ہے۔ یہی حال اصلاحی صاحب اور فراہی صاحب کے کام کا ہے۔ ان دونوں کی تصانیف میں جدید فلسفے و تہذیب و سائنس پر ایک ورق بھی نہیں ملتا اس کے باوجود غامدی صاحب کا جھوٹا دعویٰ ہے کہ دبستان شبلی جدید و قدیم علوم کا جامع ہے۔ فلسفے کو چھوڑ دیجیے۔ مغربی سوشل سائنسز پر بھی فراہی، اصلاحی، غامدی مکتب فکر نے ایک سطر نہیں لکھی یہ ان مباحث کو سمجھنے اور اس پر نقد کرنے کی بنیادی اہلیت سے عاری ہیں۔ منڈی مرید کے میں ۱۹۷۰ء میں غامدی صاحب نے الاشراق کے نام سے اکادمی قائم کی اس میں بھی مغربی فلسفہ نصاب کا حصہ نہیں تھا اور ۱۹۹۳ء میں المورد اکیڈیمی قائم کی گئی تو اس کے نصاب میں بھی فلسفہ، سائنس، سوشل سائنسز کبھی شامل نہ رہے۔ عامر گزدر، مولوی حبیب الرحمان المورد اکیڈیمی سے فارغ التحصیل ہیں اور وہ بھی اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ انھیں کبھی مغربی فلسفہ نہیں پڑھایا گیا۔ مغربی تو کیا یونانی فلسفہ کی تعلیم بھی نہیں دی گئی۔ غامدی صاحب کی زنبیل میں فلسفہ کا طومار یہی پانچ صفحات کا دفتر ہے اس کے سوا ان کے ذخیرہ نوادرات میں فلسفہ پر کوئی تحریر موجود نہیں۔

غامدی صاحب: ہیگل کا دو سطری غلط در غلط حوالہ مقامات میں

جاوید غامدی صاحب کی چار کتابوں[۱]، مقامات[۲] برہان[۳]، میزان[۴]، البیان میں صرف پہلی کتاب ''مقامات'' کے صفحہ ۸۳ پر ایک مغربی فلسفی ہیگل کا ذکر حوالے کے طور پر آیا ہے ان کے موجودہ طبع شدہ نثری ذخیرے میں غالباً کسی مغربی فلسفہ کا یہ پہلا اور آخری حوالہ ہے اور یہ حوالہ بھی مکمل طور پر غلط ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب مغربی فکر و فلسفے کے مباحث، مطالب، متن، سے قطعاً ناواقف ہیں۔ ''حق و باطل'' کے نام سے مضمون میں وہ لکھتے ہیں ''ہمارے زمانے میں فلسفہ جدلیات نے اسے تاریخی اساس فراہم کی ہیگل نے خدا کو روح عالم ٹھہرایا جو تاریخ کے تھیٹر میں انسان۔ ایک بے شعور او ربے ارادہ اداکار۔ کے ذریعے سے اپنی تکمیل کر رہا ہے''۔

غامدی صاحب ہیگل کے فلسفے اور شارحین سے ناواقف:

یہ مغربی فلسفی ہیگل کا صرف دو سطری حوالہ ہے اور یہ بھی مکمل طور پر غلط ہے۔ اس غلط حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہیگل کے فلسفے سے بھی واقف نہیں۔ ہیگل نے فلسفے میں Absolute، World Sprit، Ideal اور Guist کی اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ GOD کی اصطلاح استعمال کر سکتا تھا لیکن

اس نے GOD کے بجائے دیگر اصطلاحات کا سہارا لیا کیونکہ وہ خدا کے تصور پر فلسفے کی بنیاد استوار کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہیگل کے تمام اہم شارحین میں سے کسی ایک نے ہیگل کے فلسفے میں خدا کو روح عالم World Sprit کا متبادل یا مترادف قرار نہیں دیا۔ عصر حاضر میں ہیگل کا سب سے بڑا شارح چارلس ٹیلر ہے ہیگل ریڈر اور Sources of self اس کی مشہور کتابیں ہیں اس کی تشریحات میں کہیں روح عالم کو خدا نہیں قرار دیا گیا ہیگل کے شارحین کے دو گروہوں Left Hegalion اور Right Hegalion مکاتب فکر کے کسی مفکر نے روح عالم کو خدا نہیں لکھا مارکسی مفکرین کے دو اہم مکاتب فکر Russian Marxists اور Westren Marxists سے متعلق کسی مفکر نے مارکس و ہیگل پر لکھتے ہوئے روح عالم کے حوالے سے خدا کے تصور کا رسمی ذکر بھی نہیں کیا۔

غامدی صاحب نے رچرڈ رارٹی، ڈلیوز کو نہیں پڑھا:

ہیگل کے منہاج علم میں خدا کے تصور کو شامل و داخل کرنے کا سہرا اردو میں فلسفے پر لکھنے والے دو افراد کے سر ہے بائیں بازو کے مفکر سبط حسن جنہوں نے موسیٰ سے مارکس میں یہ احمقانہ خیال پیش کیا دوسرے جاوید غامدی جنہوں نے مقامات میں سبط حسن کی پیروی میں روح عالم کو خدا قرار دیا۔ غامدی صاحب پوسٹ ماڈرن فلسفہ کے کسی فلسفی سے واقف نہیں۔ وہ گزشتہ پانچ برس سے مغرب کے قصیدے پڑھ رہے ہیں انھوں نے امریکہ کے ریاستی فلسفی رچرڈ رارٹی کی تصانیف اور اکیسویں صدی کے سب سے بڑے فرانسیسی فلسفی ڈلیوز کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ مغرب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے کے تصور سے بھی توبہ کر لیتے وہ وحید الدین خان کی طرح چند مشہور زمانہ کتابوں کو پڑھ کر [Popular books] جنھیں ہم ''چلتا پرزہ'' کہہ سکتے ہیں مغرب کو سمجھنے پڑھنے اور دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ جس فریڈم Freedom کو اسلام سے ثابت کر رہے ہیں اسے مغرب میں کوئی فریڈم تسلیم نہیں کرتا مغرب کی اصطلاح ''فریڈم'' کا وہ مطلب بھی نہیں ہے جو غامدی بیان کر رہے ہیں ڈلیوز تو مغرب کی فریڈم پر لعنت بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ سب جھوٹ ہے کہ ہمیں Freedom مل گئی ہے اگر یہ سچ ہوتا تو پھر آج ماں اور بیٹے، باپ اور بیٹی، بہن اور بھائی کے رشتے کیوں قائم ہیں ہم اگر برابر ہیں تو ان رشتوں کے مابین جنسی تعلقات میں کیا رکاوٹ ہے وہ مغرب پر لعنت بھیجتا ہے کہ وہ ابھی تک Freedom کو حاصل نہیں کر سکا بے چارے غامدی صاحب کو فلسفے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ مغرب اور اسلام کو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلانے کے مدعی غامدی صاحب مغربی فکر و فلسفی کے بنیادی مباحث سے ناواقف ہیں لیکن اس کے باوجود دعویٰ ہے کہ دبستان شبلی قدیم و جدید علوم کا جامع ہے اور عالم اسلام کی قیادت اس جاہل، بلکہ اجہل، نالائق، نکمے مکتب فکر کا مقدر ہے۔ اس جھوٹ پر سوائے اس کے کیا کہا جائے۔ اس حادثہ وقت کو کیا نام دیا جائے؟

غامدی صاحب کے خود رو مکتب فکر کے کرنے کا کام

غامدی صاحب قرآن کے خلاف مستشرقین کے کام سے ناواقف

جناب جاوید غامدی اور ان کے مکتبہ فکر کا دعویٰ ہے کہ ان کا علم قرآن سے شروع ہوتا ہے اور قرآن پر ختم ہوتا ہے اور قرآن ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہر علم کی کلید اسی سے شروع ہوتی ہے اور اس پر ختم ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ اگر خلوص نیت اور ایمان کی پختگی کے ساتھ کیا جائے تو بلاشبہ سچا دعویٰ ہے لیکن غامدی صاحب کے مکتب فکر کا یہ دعویٰ محض لفاظی کے سوا کچھ نہیں۔ دنیا بھر میں مستشرقین قرآن کے خلاف مسلسل تاریخ و تحقیق کے انبار لگا رہے ہیں اور قرآن کو متنازعہ محرف، غیر عربی، غلط، متضاد افکار کا آمیزہ، چوتھی ہجری کا مرتبہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں لیکن اشراق کے تیس سالہ ریٹے ساں کی سولہ سالہ فائل اور غامدی صاحب کی تین سو تقاریر میں مستشرقین کی اس مہم جوئی پر اس حلقے کی خامشی حیرت انگیز ہے۔ علم و فضل کی مسند شبلی پر بیٹھنے کے دعووں کے ساتھ معائدین اسلام کی مہم جوئی سے غض بصر کا کیا مطلب ہے؟ غامدی صاحب کا پورا حلقہ، اس حلقے کا تمام سرمایہ، اس حلقے کی افرادی قوت صرف اور صرف اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے، اسلامی اقدار و روایات کو متنازعہ بنانے، اکابرین امت کی توہین، تذلیل، تردید پر صرف ہو رہی ہے۔ یہ دین کی خدمت نہیں۔ مغربیت جدیدیت اور امریکہ کی بہترین خدمت ہے جس کا یقیناً بہترین معاوضہ ملے گا اور مل رہا ہے۔ قرآن پر مستشرقین کے حملوں کے سلسلے میں چند حوالے غامدی صاحب کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اگر وہ اہلیت رکھتے ہوں تو اس سمت میں مثبت کام کریں اور امت کو پارہ پارہ، ریزہ ریزہ کرنے کے بجائے مستشرقین سے پنجہ آزمائی فرمائیں۔

۱۔ www.geocities.com نامی ویب سائٹ سے "**هل القرآن معلوم**" کے نام سے قرآن کے موجودہ نسخے کو محرف ثابت کرنے کے لیے تاشقند کے مصحف عثمانی سے موجودہ قرآن کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ نسخۂ تاشقند ڈاکٹر حمید اللہ فراہی پہلے ہی مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں لیکن اس ویب سائٹ کا کوئی جواب المورد، اشراق، ریٹے ساں کی جانب سے نہیں دیا گیا۔ مغرب کے ممتاز ترین مستشرقین [۱] Michael Cook,

Patricia Crone[۳] Martin Hinds[۲] John wansbrough نے قرآن پر اعتراضات کرتے ہوئے مختلف سوالات اٹھائے ہیں۔ ان سوالات اور اعتراضات میں بہت سے سوالوں کا رد یا ان سے علمی و تحقیقی اختلاف مغرب کے دوسرے مستشرقین نے کیا۔ لیکن غامدی صاحب کے حلقے کے کسی رسالے کسی درس، کسی تقریر میں اس موضوع پر کوئی تحریر، تقریر نہ پڑھنے کو ملی نہ سننے کو جو افسوس ناک بات ہے۔ کعبہ کی حفاظت کے لیے پاسباں مغرب کے صنم خانے سے تو مل گئے، لیکن عالم اسلام کے صنم خانہ غامدی کا کوئی محقق اپنے علم کا پشتارہ لے کر مغرب کے مقابلے کے لیے نہیں نکلا، کیوں کہ ان میں اہلیت ہی نہیں ہے۔ یہ جدید کٹھ ملا ہیں جن کے پاس ٹوپی نہ پہننا، پاجامہ گھسیٹ کر چلنا، عورت کے سر سے چادر کو اتروانا، عورت مرد کے ہاتھ ملوانا، عورت مرد کو باتیں کرنے کی آزادی دلانا، ہم جنس پرستی کرانا، اہم عصری فقہی مسائل ہیں اور یہ جدید مُلا بے چارے قدیم مولویوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں کہ انھیں دنیا کا کچھ علم نہیں جب کہ قدیم مولوی الحمدللہ علم کردار اور معلومات میں ان جدید ملاؤں سے ہزار درجہ بہتر برتر اور افضل ہیں، ان جدید ملاؤں کو تو دین کا بھی پتہ نہیں ہے۔ یہ دنیا یعنی مغرب، جدید فلسفہ، سائنس ٹیکنالوجی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

[۳] المانوی ماہر لسانیات Christoph Luxen Berg نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن خالص عربی زبان میں نازل ہی نہیں ہوا۔ اس کا ۳۰ فیصد حصہ Syro Aramic زبان پر مشتمل ہے۔ اس لیے قرآن کے کچھ حصے ہمیشہ سے مفسرین کے لیے ناقابل فہم رہے۔ غامدی صاحب کا حلقہ اس ماہر سے بھی لاعلم ہے۔ مستشرقین کے اعتراضات پر غامدی صاحب کی خامشی کے دو اسباب ہو سکتے ہیں یا تو وہ اور ان کے شاگرد ان اعتراضات کا جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتے یا جواب دینا ہی نہیں چاہتے کہ مغرب میں قرآن پر سے کفار کا یقین اٹھا دیا جائے اور مشرق میں مسلمانوں کا اسلام اور اس کی تاریخ پر سے اعتماد ختم کر دیا جائے۔ ہمارے خیال میں دونوں اسباب درست ہیں۔

[۴] ایک اور جرمن اسکالر Gerd R. Puin نے یمن کی ایک قدیم مسجد سے ۲۵ سال پہلے ہزاروں بوسیدہ عربی صفحات حاصل کیے۔ پانچ سال تک ان صفحات کی عکس بندی اور ترتیب میں صرف ہوئے۔ لیکن ابھی کوئی بڑا کام سامنے نہیں آیا لیکن اس نے ابتدائی تحقیقات کے بعد ایک مختصر مضمون میں ان اوراق سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ Quran is a cocktail of texts. غامدی صاحب اور ان کے حلقے نے اس افتراء کا جواب نہیں دیا۔

[۵] Hermunitics کے ذریعے قرآن کے نئے مفاہیم، مطالب، اشارات اخذ کرنے، وضع کرنے کی کوشش جرمنی میں زور و شور سے جاری ہے اور چند سالوں میں ایک ''جدید قرآن'' جرمنی سے شائع ہونے والا ہے۔ افسوس کہ جاوید غامدی صاحب کے حلقے میں فلسفے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ مغربی فلسفے کے عمیق مطالعے کے بغیر مغرب سے مقابلہ بھی ممکن نہیں۔ غامدی صاحب بھی فلسفے پر عبور نہیں رکھتے، ان کا علم فلسفہ نہایت سطحی ہے اپنی زندگی میں انھوں نے فلسفے پر صرف ایک مضمون حق و باطل کے نام سے لکھا ہے جو ان کی ویب سائٹ urdu.at-mawrid.org سے

۲رمئی ۲۰۰۷ء کو حاصل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ان کی کتاب مقامات میں بھی شامل ہے۔ غامدی صاحب کی تمام تحریروں میں صرف ایک مغربی فلسفی ہیگل کا دوسطری حوالہ ہے وہ بھی غلط در غلط ہے۔ اس کی تفصیل اس شمارے کے دوسرے مضمون میں دیکھیے۔

[۶] ایک اور مغربی مفکر Christoph Burgmer سے بھی غامدی صاحب کا حلقہ ناواقف ہے۔ اس کی کتاب Streit umden Koran قرآن پر مغربی معاندانہ مطالعات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ وہ قرآن کے وجود کا تاریخی طور پر قائل ہے لیکن تفہیم قرآن کے لیے historio-liguistic finding کو اساس اور بنیاد بناتا ہے۔ وہ قرآن کو کلام اللہ قرار دیتا ہے۔ لیکن تاریخ کے سفر میں وہ کلام اللہ کے مطالب ومفاہیم کو بدلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس کتاب کا ناقدانہ جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کیونکہ غامدی صاحب خود اس فلسفے کو عالم اسلام میں عام کر رہے ہیں۔ آیات قرآنی کا مطلب نہ صحابہ کو معلوم تھا نہ ائمہ اربعہ کو، نہ علماء صلحاء فقہاء امت کو اب تمام مطالب پندرہ سو سال کے بعد غامدی صاحب پر کھل رہے ہیں کہ یہود ونصاریٰ سے مراد اس زمانے کے تھے، اس زمانے کے یہود ونصاریٰ تو قرآن کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ یہ تو مومنین اور کاملین ہیں، ان سے کیا اختلاف یہ تو اہل خیر وحق ہیں۔

[۷] غامدی صاحب اور ان کا مکتبہ فکر Burgmer اور Christoph Luxenberg کے مکالمے The Koran as Philological mine کا مطالعہ فرمائیں تو ٹوپی سنت یا بدعت، ختنہ عورت کی ہو یا مرد کی، پائجامہ اونچا یا نیچا، اجتہاد کا حق کسے، صرف علماء کو یا ہر اسکالر کو، خدا ہے یا نہیں جیسے پامال موضوعات پر علمیت بگھارنا بھول جائیں وہ مسائل جو امت نے طے کر دیے جن پر تعامل امت ہے ان کو موضوع بحث بنانا اور مغرب کی یلغار، کفر کی تلوار، باطل کی للکار سے صرف نظر کرنا جدیدیت پسندوں کا خاص طریقہ ہے کیونکہ یہ سامراجی طاقتوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔

[۸] مشہور زمانہ Apostate ابن وراق جو امریکہ میں مقیم ہے اس کی کتاب "The Quest for HistoricalMohammad" اپنے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے جو رسالت مآبؐ کے بارے میں مغربی ذہنیت، وہاں کے ذہن اور رویے کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، اس کتاب میں وراق نے ان تمام مستشرقین مفکرین، محققین کے اہم اور چیدہ مقالے جمع کر دیے جو ذات رسالت مآبؐ اور اسلام کی تاریخیت پر نقد و جرح کرتے ہیں۔ مثلاً Henry Lammens، John Wohnsbrough، Patricia Crone وغیرہ وغیرہ۔ اس کتاب کے ذریعے Historicity of Islam and its text کو متنازعہ بنانے کی ناقص علمی تحقیقی تاریخی کوششیں کی گئیں ہیں۔ غامدی صاحب کے اہل قرآن اس سے بھی ناواقف ہیں۔

[۹] جناب غامدی صاحب کا پورا مکتبہ فکر اگست ۱۹۹۵ء میں Trinity College کیمبرج میں ڈاکٹر جمال بداوی اور مستشرقین کے مابین Is the Quran the word of God کے عنوان پر ہونے والے مکالمے سے بھی لاعلم ہے۔ اس موضوع پر بحث میں بے شمار مفکرین شامل ہوتے چلے گئے جن کی تفصیلات ویب سائٹ

http://www.domini.org/debate/home.htm پر پڑھی جاسکتی ہیں، اس موضوع سے متعلق مزید معلومات کے لیے http://debate.org.uk/topics/history/debate/partI.htm#D سے رجوع کیا جائے۔ غامدی صاحب کے مکتبہ فکر نے جسے فخر ہے کہ وہ عالم اسلام کا واحد مکتب فکر ہے جو قرآن میں ڈوب کر ابھرا ہے اور صرف وہی قرآن کی حقیقی روح، اس کی لغت اس کی عربیت پر عبور رکھتا ہے۔ قرآن کے خلاف ہونے والی عالمی سازش سے بالکل بے خبر ہے۔ یہ بے خبری نادانستہ نہیں دانستہ ہے۔ اس غص بصر کا صرف ایک ہی مطلب ہے مستشرقین وہی کام مغرب میں کریں جو غامدی صاحب، وحیدالدین خان، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر فتحی عثمان، ڈاکٹر رشید جالندھری، ڈاکٹر خالد مسعود، زاہدالراشدی، ڈاکٹر محمود غازی، علامہ یوسف قرضاوی عالم اسلام میں انجام دے رہے ہیں۔

مصر میں مفتی عبدہ، انگریزوں کے آلہ کار تھے اور انگریزوں نے عبدہ اور ان سے متاثر سیاسی جماعت کی سامراج کے لیے خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی تفصیل ساحل کے مارچ، اپریل، مئی ۲۰۰۵ء کے شماروں میں ملاحظہ فرمایے۔ ان شماروں میں عالم اسلام کے ہر حصے میں غامدی صاحب جیسے جدیدیت پسندوں کی تاریخ تحریر کی گئی ہے کہ جدیدیت پسند اسلام کے حصار میں کیسے نقب لگاتے ہیں۔ علامہ جمال الدین افغانی برطانوی اور روسی استعمار کی دہری خدمات انجام دیتے رہے۔ سرسید انگریزوں کے مسلمہ ایجنٹ تھے۔ مولوی چراغ علی، کرامت علی جونپوری، جسٹس امیر علی، [ہند کے وائسرائے کی سالی امیر علی کی بیوی تھی اس کی تفصیل فروری ۲۰۰۷ء کے ساحل میں پڑھیے] کلکتہ کے خدابخش، سب استعماریت کی خدمت میں مصروف تھے۔ پاکستان میں ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر فضل الرحمان، ڈاکٹر رشید جالندھری، جعفر شاہ پھلواری، غلام احمد پرویز، جاوید غامدی امریکی اور مغربی استعمار کے فطری حلیف ہیں۔ اسی لیے ان تمام مفکروں اور دانشوروں کی ہر تحریر و تقریر میں اسلام کے خلاف مسلمہ مکاتب فکر کے خلاف بہت کچھ دلائل ملیں گے لیکن ان کی کسی ایک تحریر و تقریر میں مغرب، عالمی استعمار، یہودیت، عیسائیت، جدیدیت، ماڈرن ازم، کیپٹل ازم، لبرل ازم، وحدت ادیان، جمہوریت، جدید سائنس کی تباہ کاریوں کے بارے میں ایک لفظ، ایک حرف، ایک سطر نہیں ملے گا۔ کیونکہ یہ اجہل ان امور کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اور اگر کچھ غلط سلط جانتے ہیں تب بھی یہ مغرب کو الحق اور اس کی سائنس و ٹیکنالوجی کو الکتاب قرار دے کر اس میں کوئی نقص نہیں نکالتے صرف اس پر ایمان لے آتے اور مغرب کے سامنے سربہ سجود ہو جاتے ہیں۔ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا۔

مستشرقین کی فکری یلغار کے چند نمونے اس لیے پیش کیے گئے ہیں کہ یہ غامدی صاحب اور ان کے حلقے کے کرنے کے کام ہیں جن کو غرہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ عربی جاننے، انگریزی سمجھنے والے اہل علم ان کے حلقہ مفکرین میں داخل شامل ہیں۔ اسلام کے دشمنوں کے خلاف محاذ جنگ گرم کرنے کے بجائے اسلام کا دفاع کرنے والوں اور اسلام کو محفوظ طریقے سے امت تک منتقل کرنے والوں کے خلاف غامدی صاحب کا جہاد اکبر ان کے استعماری حلیف ہونے کی کھلی شہادت دے رہا ہے۔

جاوید غامدی اور حمید الدین فراہی آگ اور پانی کا موازنہ

ایک سنت و سادگی کا نمونہ دوسرا عیش و عشرت کا مرقع

داڑھی، تہہ، بیچ کی مانگ نکالنا فراہی کی نظر میں سنت ہے

فراہیؒ صاحب کی تحقیق کے مطابق پردہ فرض ہے

[ساحل اپریل میں آپ نے جاوید غامدی صاحب پر تنقید کرتے کرتے استاد الامام حمید الدین فراھیؒ پر بھی سخت تنقید فرمائی ھے. حقیقت یہ ھے کہ فراھیؒ صاحب کا غامدی سے کوئی تقابل ھی نھیں ایک آگ ایک پانی ایک سنت کا نمونہ دوسرا عیش و عشرت کا مرقع دونوں کا طور.طرز زندگی، طرز فکر، عادات اطوار تک مختلف ھیں. آپ نے فراھی صاحب کو غامدی صاحب کے برابر لاکر فراھی صاحب کی توھین کی ھے اور ھماری دلازاری غامدی صاحب پر آپ نے جو کچھ لکھا ھے وہ درست ھے لیکن غامدی کا ملبہ مدرسہ اصلاح اور فراھیؒ پر نہ ڈالیے غامدی کا مدرسہ اصلاح یا فراھی سے کوئی تعلق نھیں وہ تو نفس پرست انسان ھیں جو قرآن کے الفاظ میں ''خواھش نفس کی پرستش میں مبتلا ھیں اور اپنے ھر کفر، نفاق، تحقیق فتوے کا ماخذ فکر فراھی کو بتا کر امت کو گم راہ کررھے ھیں. فراھی صاحب پر یہ تحریر ذکر فراھی سے مرتب کی گئی ھے. زبید احمد اصلاحی]

مدرسہ اصلاح سادگی کا پیکر: المورد عیش و عشرت کی ثقافت

''مدرسہ کے یہ مدرسین جس سادگی، اخلاص اور ایثار کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کی مثال ہم کو کسی اسلامی درس گاہ میں نہیں ملتی، سب سے بڑی تنخواہ مدرس اعلیٰ مولانا شبلی صاحب ندوی کی ہے، پینتیس

روپے، درانحالیکہ ان کے پڑھائے شاگرد اور ان کے ساتھی اس سے دوگنی چوگنی زیادہ تنخواہ پا رہے ہیں''۔ ''مدرسہ اصلاح میں کام کرنے والے چند مدرس نہایت ایثار پیشہ، بے غرض اور مخلص علماء ہیں، جن میں کچھ ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ اور کچھ خود اسی مدرسہ سے نکلے ہوئے ہیں۔ مدح وستائش نہیں واقعہ ہے کہ ان مدرسین نے مہینوں قوت لایموت پر گزر کر کے اور سالہا سال تنخواہ نہ پا کر اس اخلاص وایثار کے ساتھ کام کیا ہے اور اب تک کر رہے ہیں کہ ہمارے موجودہ قومیات میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔[ذکر فراہی، ص۴۸۹]

مولانا امین احسن اصلاحی، جو خود مدرسہ میں استاد رہ چکے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اخلاص کا حال اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے مگر فقر ہمیشہ سے اس مدرسہ کی خصوصیات میں سے رہا ہے اور اسی فقر کے اندر اس کے تمام کام ہوتے رہے ہیں۔''

المورد والوں کی تنخواہوں کا تقابل الاصلاح والوں سے:

فقر کے ساتھ ایثار واستغنا مدرسۃ الاصلاح کا وصف امتیازی ہے جو باہر سے آنے والے کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہے۔ فقر وہی ہے جس میں ذلت ومسکنت کے بجائے استغناء اور بے نیازی ہو۔ اسی فقر کے بارے میں سرورِ کونین نے ''الفقر فخری'' فرمایا۔ مولانا فراہی نے مدرسہ کے لیے جو منشور بنایا اس میں بصراحت مذکور ہے کہ یہاں کے اساتذہ تنخواہ کی توقع نہ رکھیں اور کفاف پر قناعت کریں اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا کا دیا ہوا یہ منشور مدرسہ کے لیے ''کلمہ باقیہ'' بن گیا۔ سید صاحب کے لکھنے کے مطابق شبلی ندوی کی تنخواہ جو صدر مدرس بھی تھے اور مہتمم بھی، ۱۹۳۱ء میں ۳۵ روپے تھی۔ ۴۱۔۱۹۴۰ء میں جب میرا داخلہ ہوا اس وقت بھی ان کی تنخواہ اتنی ہی تھی۔ پھر بھی زمانہ ستائی کا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک دم گرانی اس طرح بڑھی کہ اس کی کوئی حد نہ رہی۔ ۴۸۔۱۹۴۷ء میں اختر احسن اصلاحی کی تنخواہ ۵۵ روپے تھی، اس میں سے وہ پانچ روپے مدرسے کو چندہ دیتے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں اس مدرسے کے اساتذہ کی کم سے کم تنخواہ ۱۷۳ روپے اور زیادہ سے زیادہ ۲۱۷ روپے تھی، عربی درسگاہ کے اساتذہ کی تنخواہیں کم سے کم ۱۵۹ روپے اور زیادہ سے زیادہ ۲۸۸ روپے تھی۔ ہر استاد پانچ گھنٹے روزانہ پڑھاتا تھا۔[ذکر فراہی، ص۴۹۰] **اس فقر سادگی للھیت کا غامدی کے حلقے سے موازنہ کیا جائے. المورد کے فیلو، محققین کی تنخواھیں ھزاروں روپے، شاھانہ ٹھاٹھ باٹھ، گاڑی، پیٹرول، موبائل مفت اور غامدی صاحب کے عیش و عشرت دیکھیے ان کا فراھی مکتب فکر سے کیا تعلق خدا کے لیے غامدی کے نام پر فراھی مکتب کو بدنام نہ کیا جائے. امین احسن اصلاحی نے تو اپنی زندگی کے آخری دور میں انھیں عاق کر دیا تھا. ان کے اصل خلیفہ خالد مسعود تھے جو درویش آدمی تھے. اگر غامدی صاحب فقیر ھوتے تو خلافت ان کو**

مسلتی، مدرسہ میں سادگی کا عالم یہ ہے کہ ۳۰، ۴۰ سال تک فی طالب علم ۴ روپے ماہانہ خوراک تھی۔ ۱۹۷۹ء میں یہ خرچ ساٹھ روپے ماہانہ تھا۔ دال روٹی ہفتے میں دو بار چٹنی یا گوشت ملتا تھا۔ طالب علم کپڑے خود دھوتے، صفائی خود کرتے اور استری بھی خود کرتے ہیں۔

فراہی صاحب پردے کے قائل تھے:

بیگم نواب صاحبہ بھوپال کے استفسار کے جواب میں فراہی صاحب نے لکھا اجنبی سے پورا پردہ کرنا واجب ہے اور قرآن نے بھی حجاب واجب کیا ہے جو شرفاء میں مروج ہے بلکہ اس سے زائد ہے۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۱۵ء [نقوش خطوط نمبر ۱۹۵۷ء] **غامدی صاحب تو پردے کے قائل ھی نھیں وہ کھتے ھیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم نھیں پردہ کیا ھے یہ لفظ ھی غلط ھے. اب ان کی عربی فراھی سے بھتر تو نھیں ھوسکتی. امین احسن اصلاحی کی روایت کے مطابق امام فراھی کا فرمان تھا کہ:**

''سورہ نور میں گھر کا پردہ ہے اور سورہ احزاب میں باہر کا پردہ ہے۔ اسی اشارے سے میں نے پردے کے متعلق اپنی بحث کو پھیلا دیا ہے اسی طرح مولانا فراہی نے کہیں لکھا ہے کہ رجم سورہ مائدہ سے مستنبط ہوتا ہے۔ اشارہ سورہ نور کی آیات ۳۹۔۳۰، احزاب ۵۹ اور مائدہ ۳۳ کی طرف ہے۔ [ذکر فراہی، ص ۸۶۸]

مولانا امین احسن اصلاحی نے مجھ سے بیان کیا۔

اس کو عیب کہیے یا ہنر مولانا فراہی کو اس کی پرواہ مطلق نہیں ہوتی کہ ان کی بات کوئی سمجھے گا یا نہیں۔ وہ اشارات میں بات کہنے کے عادی ہیں۔ پردے کے متعلق انہوں نے کہیں صرف اس قدر لکھا ہے کہ سورۂ نور میں گھر کا پردہ ہے۔ اور سورۂ احزاب میں باہر کا پردہ ہے۔ مسلسل غور کے بعد میں کہیں جا کر اس اشارے کو سمجھا اور پردے کے متعلق اپنی بحث کو اسی بنیاد پر پھیلایا۔ اسی طرح مولانا فراہی نے کہیں یہ بھی لکھا ہے یا کبھی زبانی گفتگو میں کہا کہ رجم سورۂ مائدہ سے مستنبط ہوتا ہے۔ [ذکر فراہی، ص ۸۶۸] **غامدی صاحب تو اب پردہ کے قائل نھیں وہ سر پر اوڑھنی کو بھی غلط سمجھتے ھیں کھتے ھیں کہ پردہ کا لفظ ھی غلط ھے بے چارے اللہ نے پردے کا لفظ استعمال نھیں کیا مولوی پردہ پردہ کررھے ھیں یہ لفظ ھی غلط ھے جبکہ امام فراھی نے خود پردے کا لفظ استعمال کیا امام اصلاحی پردے کے قائل تھے غامدی صاحب اصلاحی و فراھی سے بڑے عالم نھیں نہ ھی ان کی عربی اصلاحی و فراھی سے اچھی ھے نہ ھی ان کا علم اور قرآن پر نظر دونوں سے بھتر ھے دونوں پر دے کے قائل تھے اصلاحی صاحب کی کتاب "پاکسانی عورت دوراھے پر" پڑہ لیجیے۔**

داڑھی کے بارے میں مولانا فراہیؒ کا نقطہ نظر:

فاروق نعمانی کا بیان ہے کہ میں ان دنوں کلین شیو رہتا تھا۔ ایک دن مولانا میرے کمرے میں آئے۔ کریم کی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ پوچھا یہ کیا ہے میں نے بتایا کہ کریم جو شیو کے بعد چہرے پر لگاتے ہیں۔ مولانا نے کہا ''اپنا چہرہ دیکھو اور میرا چہرہ دیکھو''۔ ان کی اس بات کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں نے اس دن سے کریم لگانا چھوڑ دیا۔[ذکر فراہی، ص ۵۲۶]

مولوی ضیاء الدین اصلاحی نے مولانا اختر احسن اصلاحی سے سنی ہوئی ایک روایت مجھ سے یہ بیان کی کہ موضوع بمہور [مولانا امین احسن اصلاحی کا گاؤں] کے دو نوجوان انیس اور الیاس جو آپس میں بھائی تھے مدرسے پر آئے، ان میں سے بڑے بھائی کی داڑھی تراش خراش کی وجہ سے چھوٹی تھی جب کہ چھوٹے بھائی کی داڑھی لمبی تھی۔ مولانا شرعی وضع کے معاملے میں بہت ذکی الحس تھے۔ وہ ڈاڑھی کی کتر بیونت تک کو ناپسند کرتے تھے۔ مزاحاً انھوں نے پوچھا کہ ان دونوں میں بڑا کون ہے۔ حاضرین نے بتایا کہ یہ بڑے ہیں۔ مولانا نے فرمایا یہ کیسے بڑے ہیں؟ یہ نہیں وہ بڑے ہیں۔ مولانا کا اشارہ چھوٹے بھائی کی طرف تھا جن کی ڈاڑھی بڑی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بڑا وہ ہے جس کی ڈاڑھی بڑی ہے۔ ظاہراً معلوم بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ بڑی ڈاڑھی والا آدمی بڑا لگتا ہے۔ طعن و تشنیع کے بجائے جس میں دلآزاری ہوتی ہے اور جس سے ضد پیدا ہوتی ہے مولانا چاہتے تھے کہ لطیف پیرایے میں اپنی بات کہہ دیں تا کہ اصلاح ہو۔[ذکر فراہی، ۵۲۶]

فراہیؒ صاحب داڑھی کو سنت سے بڑھ کر سمجھتے تھے:

ذکر فراہی کے مصنف کے مطابق ''ڈاڑھی بھی ان امور میں سے ہے جن کا ذکر مولانا کے حالات میں کثرت سے آتا ہے۔ ڈاڑھی کی شرعی حیثیت اور دین میں اس کی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے۔ ڈاڑھی کے متعلق مولانا ابوالکلام کا ایک جملہ بہت مشہور ہے کہ ''اسلام میں ڈاڑھی ضرور ہے مگر ڈاڑھی میں اسلام نہیں''۔ فقہی اعتبار سے جو رائیں اور فقرے ہیں ان کی اپنی جگہ ہے۔ لیکن اس بارے میں مولانا فراہی کا اپنا نقطہ اور طرز عمل ایک دم الگ معلوم ہوتا ہے جو امور دین میں ان کے مجموعی رویے سے ہم آہنگ ہے۔ اس مسئلہ پر مولانا اصلاحی اور مولانا فراہی کے مابین جو گفتگو ہوئی وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مولانا اصلاحی لکھتے ہیں۔

''اسی طرح ایک مرتبہ ڈاڑھی کے مسئلہ پر بھی بحث چھڑ گئی۔ مولانا دین میں اس کی اہمیت واضح کر رہے تھے اور میں ان کے سامنے یہ بات پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دین میں ڈاڑھی کی فی الواقع وہ اہمیت نہیں ہے جو اس کو دی جا رہی ہے۔ مولانا کچھ دیر تک تو مجھے ان احادیث کا مطلب سمجھاتے رہے جو اس بارہ میں وارد ہیں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ میں ڈاڑھی کی اہمیت کا کسی طرح قائل نہیں ہو رہا ہوں تو فرمانے لگے کہ

''اچھا فرض کیا کہ اس کی دین میں بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ چھوٹی سی چیز بہت بڑی بڑی چیزوں کا پتہ دیتی ہے؟'' میں نے عرض کیا وہ کیسے؟ فرمایا ''جس طرح راکھ کی ایک چٹکی اڑا کر ہم ہوا جیسی عظیم الشان چیز کا پتہ چلا لیتے ہیں کہ اس کا رخ کدھر کو ہے اسی طرح ایک شخص کے چہرے پر ڈاڑھی کے ہونے اور نہ ہونے سے ہم یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کا میلان کس طرف ہے، اسلام کی طرف یا غیر اسلام کی طرف؟'' مولانا کے اس جواب کے بعد میں خاموش رہ گیا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ڈاڑھی چاہے دین میں بجائے خود بہت زیادہ اہمیت رکھنے والی چیز نہ ہو لیکن جہاں تک ایک مسلمان کا تعلق ہے یہ اس کے دل کے رجحانات کے لیے ایک بیرومیٹر [Barometer] کا کام ضرور دیتی ہے اور اگر یہ بات ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دین میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور ہونی چاہیے۔ [ذکر فراہی، ص ۸۴۴]

ڈاڑھی کے سلسلے میں ڈپٹی عبدالغنی ساکن جگیہاں کا یہ واقعہ ایک نہیں متعدد ذریعوں سے میں نے سنا۔ مولانا اختر احسن کے صاحبزادے مولوی غالب اصلاحی استاذ مدرسۃ الاصلاح، امین الدین صاحب ساکن شہر اعظم گڑھ اور مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین نے مجھ سے بیان کیا۔

غامدی صاحب کے اکثر ساتھی داڑھی منڈے ہیں:

مولانا فراہی داڑھی منڈوں سے ہاتھ نہیں ملاتے تھے:

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ڈپٹی عبدالغنی نے مولانا فراہی سے ہاتھ ملانا چاہا تو انھوں نے ان کی غیر شرعی وضع کی وجہ سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ وہ ڈاڑھی منڈاتے تھے اور کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ یہ تو مولانا فراہیؒ کی غیرت، حمیت اور شدت کا حال تھا۔ **دوسری جانب غامدی صاحب کی المورد کی شوریٰ میں اکثر داڑھی منڈے ہیں. داڑھی کی ضرورت کے غامدی صاحب کسی صورت میں قائل نہیں ہیں. اب غامدی صاحب اور فراہی کا تقابل آپ خود کر لیجیے۔** جیسا کہ اصلاحی صاحب کے بیان سے واضح ہوتا ہے۔ مولانا ڈاڑھی کے معاملے میں زیادہ ذی الحس تھے۔ ڈپٹی عبدالغنی صاحب کے ساتھ آزردگی کی بعض دوسری وجہیں بھی تھیں۔ ڈپٹی صاحب سود کو جائز سمجھتے تھے۔ ممکن ہے اس زمانے میں صوم وصلاۃ کی پابندی سے بھی آزاد رہے ہوں۔

ایک راوی مولوی عبدالسلام ساکن پھریہا نے میری فرمائش پر اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا۔ وہ کہتے ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ مولانا فراہی سرائے میر تشریف لے جا رہے تھے۔ گاڑی کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ اسٹیشن کی بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ اس زمانہ میں پورب اور پچھم سے آنے والی دونوں ٹرینوں کا میل پھریہا میں ہوتا تھا۔ اس دن پچھم والی ٹرین ذرا پہلے آ گئی۔ اس ٹرین سے ڈپٹی عبدالغنی انصاری اترے۔ مولانا کو

دیکھ کر فوراً ان کی طرف بڑھے۔ انھوں نے سلام کیا۔ مولانا نے جواب دیا۔ عبدالغنی صاحب نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مولانا نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا میں ڈاڑھی منڈوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ عبدالغنی صاحب بہت چیں بہ جبیں ہوئے اور طیش میں آ کر بولے۔ مولانا آپ نے مجمع عام میں مجھے ذلیل کیا۔ اگر آپ کو تنبیہ ہی کرنی تھی تو کسی وقت تنہائی میں سمجھا دیتے۔

داڑھی نہ رکھنے والا قیامت میں رسوا ہوگا: فراہیؒ

مولانا کا اصول تھا کہ جب کوئی مخاطب ہوتا تو خاموش رہتے تھے۔ جب متکلم خاموش ہو جاتا تھا تب مولانا جواب دیتے تھے۔ عبدالغنی صاحب کی گفتگو ختم ہوگئی اور ان کے دل کا غبار نکل گیا تو ہم اس انتظار میں تھے کہ اب مولانا ڈاڑھی کی اہمیت پر شرعی نقطہ نظر سے روشنی ڈالیں گے اور لمبی چوڑی تقریر فرمائیں گے لیکن مولانا نے جواب میں صرف دو جملے فرمائے۔ انھوں نے کہا عبدالغنی تمہاری تقریر کا خلاصہ یہی تھا کہ بھرے مجمع میں تمہاری رسوائی ہوئی۔ لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ ایک دن آنے والا ہے جب اس سے کہیں بڑا مجمع ہوگا اور اس سے کہیں زیادہ رسوائی ہوگی۔ [ذکر فراہی، ص۸۴۵] **مولانا فراهی کو یقین تها که داڑهی سنت هے شعار انبیاء هے، اسلامی تهذیب و معاشرت کی علامت هے سلیم اور صالح فطرت کی آواز هے جو اس سنت سے گریز کرے گا وه میدان حشر میں رسوا هوگا غامدی صاحب فرماتے هیں که داڑهی کا رسوائی سے کوئی تعلق نهیں ایسے شخص کو آپ فراهی کے ساتھ ملا رهے هیں.**

فراہیؒ صاحب نے داڑھی منڈے کو قرآن پڑھانے سے انکار کر دیا:

ڈاڑھی کے مسئلے میں اسی قسم کی ایک روایت مولوی ضیاء الدین اصلاحی نے مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کے واسطہ سے بیان کی کہ اقبال سہیل نے ایک بار مولانا سے کہا مولانا مجھے قرآن مجید پڑھا دیجیے۔ اقبال سہیل نے اس زمانے میں ڈاڑھی منڈانی شروع کر دی تھی۔ مولانا نے جواب میں فرمایا پہلے اپنی صورت ٹھیک کیجیے۔ مجھ سے سید صباح الدین عبدالرحمان نے بیان کیا۔ انھوں نے شاہ معین الدین احمد ندوی سے سنا۔

''مولانا فراہی حج سے واپس آئے تو ترکوں کی نسبت اچھے تاثرات کا اظہار کیا۔ فرمایا ''میں ان ڈاڑھی منڈوں کی قوت ایمانی دیکھ کر متاثر ہوا''۔ ترکوں سے اگر متاثر ہوئے جیسا کہ راویوں کا بیان ہے تو ان کی دوسری خوبیوں کی وجہ سے۔ ڈاڑھی منڈانا اسی طرح ترکوں کے لیے بھی عیب تھا جس طرح دوسروں کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے ان کی تعریف کرنے یا ان کے ساتھ اپنی خوشی کا اظہار کرنے میں بھی ان کے لیے ''ڈاڑھی منڈوں'' کا لفظ استعمال کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی قباحت ان کی نظر میں کم نہیں ہوئی تھی۔ [ذکر فراہی،

۸۴۶،۸۴۷] یہ حال تو مولانا فراھی کا تھا کہ داڑھی منڈوں کو قرآن تک پڑھانے کے روادار نہ تھے جب کہ غامدی صاحب پر کٹی حجاب سے بے پروا، نیم عریاں لباس میں حسن کے جلوے دکھانے والی عورتوں کو دین کی حکمت اس حکمت کا صغری کبریٰ سکھا رھے ھیں ایک طرف فراھی کا تقویٰ نیکی، صالحیت، علم اور تدین ھے . دوسری طرف غامدی صاحب کی بے دینی آوارگی، آزاد خیالی اور دین کی اقدار سے دوری ھے پھر بھی ساحل غامدی کو فراھی صاحب کے شانہ بشانہ کھڑا کر رھا ھے یہ ظلم ھے۔

فراہی کے بیٹے پوتے کبھی مدرسہ کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہوئے:

ذکر فراہی کے مصنف شرف الدین اصلاحی کے مطابق مولانا کے بیٹے سجاد نے مولانا فراہی کے طریقے کے مطابق میری جوٹھی پلیٹ روٹی کے ٹکڑوں سے صاف کی اور کھا گئے۔ مجھے حکم دیا جاتا تو بھی میں اپنے والد کی جوٹھی پلیٹ اس طرح صاف نہ کرتا جس طرح سجاد صاحب نے اپنے والد کی پیروی میں میری جوٹھی پلیٹ صاف کی یہ تربیت تھی فراہی کی وہ خود مہمان کی تکریم اس طرح کرتے تھے۔ سجاد صاحب عملاً دیندار آدمی تھے۔ انھوں نے شروع سے شرعی وضع کی پابندی کی۔ ڈاڑھی رکھتے تھے، حج کرآئے تھے۔ نماز پڑھتے تھے، روزہ رکھتے تھے، اوامر بجالاتے تھے نواہی سے بچتے تھے اور جیسا کہ آگے چل کر ہم بیان کریں گے جہاں تک ہوسکا مولانا نے اپنے لڑکوں کی تربیت اسی نہج پر کی تھی۔ مولانا کے چھوٹے صاحبزادے صاحب کا انتقال ۴؍جنوری ۱۹۷۳ءکو پھریہا میں ہوا۔ میری ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ جس زمانے میں مدرسۃ الاصلاح کا طالب علم تھا کبھی کبھی ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا، وہ مدرسہ پرآتے رہتے تھے۔ شاید مدرسہ سے ان کا کوئی رسمی تعلق بھی تھا۔ دیندار وضع کے آدمی تھے۔ وہ سجاد صاحب کی نسبت زیادہ پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ جس طرح صورت میں سجاد صاحب مولانا سے مشابہت رکھتے تھے، میرا اندازہ ہے کہ سیرت میں عباد صاحب کو مولانا سے بہرۂ وافر ملا تھا۔ مولانا کے پوتوں حمداللہ۔ عبیداللہ نے عربی پنجم تک مدرسۃ الاصلاح میں پڑھا۔ اس کے بعد سرکاری تعلیم کی طرف گئے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آج کل لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر ہیں۔ سعداللہ نے کچھ وقت مدرسۃ الاصلاح اور ندوہ میں گزارا۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کیا اور صحافت کی طرف چلے گئے۔ آج کل دعوت دہلی سے منسلک ہیں۔ حمداللہ کچھ دن مدرسۃ الاصلاح میں رہ کر جامعۃ الفلاح چلے گئے جہاں سے انھوں نے سند فراغت حاصل کی، پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل کا امتحان پاس کر کے طبیہ کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ کئی سال ہوئے علی گڑھ سے فراغت کے بعد عملی زندگی کی جدوجہد میں شامل ہو چکے ہیں۔ [ذکر فراہی، ص ۶۷۰] یہ کردار اسوہ حضرت فراہیؒ کا ہے جب کہ دوسری جانب دنیا دار غامدی صاحب کا کردار

دیکھیے۔ اشراق کی مجلس مشاورت میں اپنی بیٹی بیٹے اور بچوں کو شامل کر دیا ہے سات سال اور چودہ سال کی لڑکی لڑکے سے کیا مشاورت ممکن ہے؟

غامدی صاحب کے یہاں ملوکیت کا پورا اہتمام: شیر خوار بھی مشیر ہے

غامدی صاحب نے فراہی صاحب کی زندگی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے کسی بیٹے، بیٹی، پوتے، پوتی کو مدرسہ اصلاح کی مجلس انتظامی میں کبھی شامل نہ کیا، نہ ان کے بچوں کا روزگار کبھی اس مدرسے سے وابستہ رہا نہ ہی فراہی صاحب کے کسی بیٹے بیٹی کو ''الاصلاح'' رسالے کی مشاورت میں شامل کیا گیا نہ زندگی میں نہ مرنے کے بعد۔ لیکن غامدی صاحب نے استاد امام الفراہی کے برعکس اشراق جیسے دینی پرچے کی مجلس مشاورت میں اپنے آٹھ سالہ بچے جنید غامدی کو جب وہ پانچویں جماعت کا طالب علم تھا شامل کر دیا۔ میٹرک میں پڑھنے والی اپنی صاحبزادی امیمہ مریم کو بھی اس دینی رسالے کی مجلس مشاورت میں جبراً داخل کر دیا گیا۔ معاذ غامدی اور جواد احسن غامدی بھی مجلس اشراق کی مجلس مشاورت میں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک صاحبزادے جنھوں نے ایم بی اے کیا تھا اور ٹی وی جرنلزم کا ایک دن کا تجربہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ انھیں جیو نے نہایت بھاری مشاہیرے پر بغیر کسی تجربے کے پروڈیوسر کا تقرر نامہ دیا اور ان کے والد محترم کے پروگرام غامدی کا پروڈیوسر بنا دیا۔ دنیا اولاد کے ذریعے کتنی خوش نما بنا دی گئی ہے۔

کیا یہ بچے مشاورت کی اہلیت رکھتے ہیں، جمہوریت کے دم بھرنے والے ملوکیت کو برا بھلا کہنے والے غامدی صاحب نے اپنے چاروں بچوں کو ایک مذہبی رسالے میں شامل کر کے ملوکیت کی رسم کو زندہ کر دیا ہے ان کا فراہی کی عظمت سے کیا تعلق؟ یہ چاروں نہ عربی جانتے ہیں نہ اسلام، ایک صاحب زادے نے تو حیدر آباد سے بی اے کا امتحان دیا کیوں دیا کیسے دیا ایک الگ افسانہ ہے۔ دانش سرا حیدر آباد والے اس افسانے کے کرداروں سے بخوبی واقف ہیں۔ اسلامی تحقیقی رسالوں کی تاریخ میں ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ کسی مدیر نے اپنی کمسن، نابالغ، ناسمجھ، لاعلم، جاہل اولاد کو ایک علمی و تحقیقی پرچے کی مجلس مشاورت میں شامل کر دیا ہو صرف اس لیے کہ یہ رسالہ ایک بڑی جاگیر کی صورت اختیار کرنے والا ہے لہٰذا بچوں کو اس جاگیر پر قابض کر دیا جائے۔ دنیا میں ملوث یہ مفکر اپنے آپ کو فراہی صاحب کا جانشین کہتے ہیں جو رئیس ابن رئیس ہوتے ہوئے بھی سادہ ترین زندگی بسر کرتے تھے۔ مہمانوں کی جوٹھی رکابی پونچھ کر صاف کرتے تھے۔

حمید الدین فراہی تہمد کو سنت سمجھتے تھے:

تمہد یا تہبند جس کو اعظم گڑھ کی بولی میں لنگی کہتے ہیں مولانا فراہی کی داستان حیات کا ایک عنوان بن گیا۔ مولانا فراہی تہمد پہنتے تھے۔ سب سے پہلے تو رسم دنیا کو دیکھتے ہوئے مولانا جیسے رئیس فاضل اجل کا تہمد باندھنا

ہی نا قابل تصور نظر آیا۔ خود مجھ کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی جب پہلی بار میرے علم میں آئی۔ تہمد اہل مدرسہ میں تو زیادہ اجنبی نہیں لیکن جدید تعلیم یافتوں میں اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ مولانا رئیس ابن رئیس ہونے کے علاوہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے ان متخرجین میں سے تھے جن کو سابقون الاولون ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ فی زمانہ لنگی کو دیہاتیوں کا گنوار ولباس سمجھا جاتا ہے اس لیے مولانا کے حالات میں اس کا ذکر سننے کے لیے ذہن سرے سے تیار نہ تھا۔ لیکن جب اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا سنت سمجھ کر ہر نماز پابندی سے لنگی میں ادا کرتے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے مختلف ملاقاتوں میں ایک سے زائد مرتبہ مجھ سے بیان کیا۔

''تہمد ہمیشہ فراہی صاحب کے سرھانے تکیے کے نیچے دھری رہتی تھی۔ نہیں معلوم کیوں نماز کے وقت پابندی کے ساتھ تہمد ضرور باندھتے تھے اور نماز سے فارغ ہو کر فوراً تہمد اتار کر پاجامہ پہن لیتے تھے، تہمد کے اوپر ہی شیروانی پہن لیتے تھے جو بہت خوبصورت لگتی تھی اور گلے میں مفلر لگا لیتے تو اور بھی بھلے لگتے تھے۔ مولوی عبدالباری صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ مولانا کے کندھے پر ایک لنگی ضرور رہتی تھی اور کندھے پر لنگی کا رکھنا بھی مولانا پر سجتا تھا۔ کم از کم ان کی ذات کے لیے اس میں بدنمائی کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ اس بات کی تصدیق مولوی صاحب نے بھی کی کہ وہ نماز کے وقت تہمد ضرور باندھ لیا کرتے تھے۔'' [ذکر فراہی، ۸۱۶۔۸۱۷] **غامدی صاحب پہلے فراھی کے تتبع میں تھمد باندھتے تھے اب اسے گنوار پن سمجھتے ھیں. یہ حضرت فراھیؒ سے زیادہ مھذب، زیادہ عالم اور قرآن کے زیادہ شنادر ھیں۔**

حمیدالدین فراہی کی حمیت دینی:

دین پر ادنیٰ اعتراض سن کر جوش سے بھر جاتے تھے۔ میں نے خود اپنے دور الحاد میں بارہا ان کی ڈانٹ کھائی ہے۔ ایک دن خود مولوی شبلی صاحب نے [جو آخر میں خود بھی بہت درست ہو گئے تھے] قرآن مجید کے متعلق شوخی سے گفتگو کی تھی، مولانا حمیدالدین کو گویا بخار چڑھ آیا اور جب تک مفصل تردید نہ کر لی چین سے نہ بیٹھے۔ ''غیرت دینی کے پتلے تھے، مولانا شبلی کبھی کبھی ہنسی ہنسی میں یا فرط شوخی سے مذہب پر چوٹ کر جاتے، مولانا فراہی کو اس کی ذرا برداشت نہ تھی۔ سنجیدگی سے جواب میں مقالہ یا رسالہ لکھ ڈالتے، اور جب تک لکھ نہ لیتے، محسوس ایسا کرتے کہ جیسے بخار چڑھ آیا ہو''۔ مولانا فراہی کے گاؤں کے ایک دیہاتی بزرگ نے مجھ سے اپنا یہ واقعہ بیان کیا۔

''میں اپنا کھیت دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا۔ ہمارے گاؤں کے کچھ اہیر دسہرا کا میلہ دیکھنے بگھورا جا رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ ہو گیا۔ ہم مولانا کے دروازے سے گزرے۔ دوپہر ڈھلنے کا وقت تھا۔ مولانا مرحوم گھر کے باہر کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ دعا سلام کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا سعید تم کہاں جا رہے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ اپنا کھیت دیکھنے چوراہے تک جا رہا ہوں۔ مولانا نے

ہدایت کی کہ تم دوسرے راستے سے جاؤ، ان لوگوں کے ساتھ مت جاؤ، ورنہ تمہارے اوپر بھی عذاب ہوگا۔ چنانچہ میں نے اپنا راستہ بدل دیا اس لیے کہ واقعی میں اپنا کھیت ہی دیکھنے جا رہا تھا۔''

مولانا کی نصیحت کا محرک کیا تھا۔ انھوں نے اتنی چھوٹی سی بات کا اتنی سختی سے نوٹس لیا۔ اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی دینی حس بیدار ہو۔ ورنہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں میلے ٹھیلے کے شوقین مسلمان بلا جھجک دسہرا دیکھتے ہوں مولانا کی یہ نصیحت عجیب نظر آئے گی۔ [ذکر فراہی، ص۸۳۲] **دوسری جانب غامدی صاحب سے جس میلے ٹھیلے کا پوچھیے دین میں فطرت میں ثابت کر دیں گے بسنت ہو دیوالی ہو، ہولی ہو سب حلال ہے. غامدی صاحب کا فراہی سے کوئی تعلق نہیں۔**

فراہی ہر قسم کے سود کو حرام سمجھتے تھے:

علامہ شبلی نے لکھا ''بنک کا سود میرے نزدیک جائز ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا فتوی اس کے متعلق چھپ گیا ہے''۔

شبلی کے خیال میں ہندوستان نہ دارالحرب ہے نہ دارالاسلام بلکہ دارالامن ہے۔ اور دارالامن کے حوالے سے سود کے بارے میں ان کا نقطہ نظر ان کے ایک خط سے واضح ہوتا ہے۔ مولوی ابوظفر ندوی کو لکھتے ہیں۔

''دارالامن کے احکام میں تنوع ہے، یعنی وہاں ہجرت واجب نہیں اور نہ جہاد جائز ہے۔ لیکن ربا جائز ہے۔ جس طرح لا ربا بین الحربی والمسلم۔ لیکن دبستان شبلی سے تعلق رکھنے کے باوجود مولانا فراہی سود کی ہر قسم کو حرام سمجھتے تھے اور سود کا چندہ وصول نہ کرتے تھے۔ وہ شبلی نعمانی کی جدیدیت پسندی کے خلاف تھے۔ شبلی نے ترکوں کے لیے چندے کی خاطر عید قرباں کی قربانی کو ساقط کرنے کا فتوی دیا تھا کہ کیا مسلمان کی جان مینڈھے سے سستی ہے۔ فراہی صاحب نے اسے بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ مسلمان کی مدد وحمایت ونصرت فرض ہے۔ فرض الگ ہے سنت الگ فرض کی ادائیگی کے لئے سنت کا ترک کیوں؟ فرض بھی ادا کرو سنت بھی مسلمان صاحب حیثیت صرف ایک بکرے، گائے کے برابر چندہ کیوں دے لوگ شادی، گھر، سواری، عیش پر بھاری اخراجات کرتے ہیں جو نفل ہے نہ مستحب تو وہ رقم چندے میں دینے کا فتویٰ دیا جائے، سنت کے انہدام پر فتویٰ یا اجتہاد بدعت ہے۔ اس طرح کے فتوے دین کو مضحکہ بناتے ہیں جو چاہے کھڑے ہو کر سنتوں کو ساقط کر دے تعامل امت فتوے سے ساقط نہیں ہوسکتا نہ سنت کو فتویٰ رد کرسکتا ہے۔ فراہی صاحب کے ایک عزیز شاگرد اقبال سہیل نے ''**حقیقۃ الربوا**'' نام کی ایک کتاب لکھی جو انہی دنوں چھپ گئی تھی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ڈپٹی عبدالغنی انصاری کی فرمائش اور تحریک پر انھوں نے یہ کتاب لکھی اور اس میں ربڑ کی حلت پر دلائل دیے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ

انھوں نے یہ کتاب اپنے ایک تحقیقی کارنامے کے طور پر مولانا فراہی کی خدمت میں پیش کی جب کہ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اس طرح کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ ناشر نے دیباچے میں کہیں ہلکا سا اشارہ اس طرف کیا ہے کہ مصنف شبلی اور فراہی جیسے علماء و محققین کا فیض یافتہ ہے۔ مولانا کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت برہم ہوئے۔ داڑھی منڈانے پر وہ پہلے ہی سہیل صاحب سے ناراض تھے، یہ خلاف شرع کام دیکھ کر ان کی برہمی میں اور اضافہ ہوا۔ مولانا وکالت کے پیشے کو بھی ناپسند کرتے تھے اور اس سے زیادہ ججی کے پیشے کو۔ سہیل صاحب وکالت کرتے تھے۔ انھوں نے اقبال سہیل کو بری طرح ڈانٹا۔ اس سلسلے کے بعض جملے جو لوگوں نے نقل کیے۔ ''حرام کھا کھا کر تمہارا قلب سیاہ ہو گیا ہے۔ تمہاری فطرت مسخ ہو گئی ہے..... وغیرہ'' عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کا بیان ہے کہ اقبال سہیل نے والد صاحب [مولوی محمد شفیع] کو بیچ میں ڈال کر مولانا سے معافی تلافی کی کوشش بھی کی۔ حقیقہ الربو راقم الحروف نے نہیں دیکھی مگر مولوی بدرالدین صاحب نے بتایا کہ وہ کتاب کا مطبوعہ نسخہ دیکھ چکے ہیں۔ مشہور شاعر اقبال سہیل صاحب وکیل اعظم گڑھ نے سود کے جواز پر ایک کتاب لکھی اور اپنا فخریہ کارنامہ سمجھ کر مولانا کو پیش کیا۔ مولانا نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اقبال سہیل کو ملامت کی اور کہا جھوٹ کا پیشہ اختیار کیا، حرام کو حلال ثابت کرنے کا غلط کام کیا اور اپنی ذہانت برباد کی۔ [ذکر فراہی، ص ۸۴۱۔۸۴۲] غامدی صاحب نے تو شیرازی گروپ کی قائم کردہ سرمایہ کار کمپنی کی مشاورت قبول فرمالی ہے اور پاکستان میں تمام سرمایہ کار کمپنیاں صرف اور صرف سودی کام کرتی ہیں خواہ نام اسلامی رکھ لیں۔

فراہی صاحب بیچ کی مانگ نکالنا سنت سمجھتے تھے غامدی صاحب اسے بدعت کہتے ہیں:

شرف الدین اصلاحی نے سجاد صاحب سے روایت کیا ہے کہ فراہی صاحب سر کے بال قدرے لمبے رکھتے تھے۔ سجاد صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا جیسے کہ آپ کے ہیں۔ لیکن مانگ سر کے بیچ سے سیدھی نکالتے تھے، اتباع سنت کے خیال سے۔ ایک دن میور کالج الہ آباد کے پروفیسر نامی نے مذاق میں کہا آپ اس طرح کے بال کیوں رکھتے ہیں۔ استرے سے کیوں نہیں منڈاتے۔ مولانا نے جواب میں کہا۔ پھر سنت پر عمل کس طرح ہوگا۔ مقصد یہ تھا کہ بال نہیں ہوں گے تو مانگ کیسے نکالی جائے گی۔ نامی صاحب نے کہا پھر پٹا رکھ لیجیے۔ مولانا نے کہا اس سے شیروانی کے کالر خراب ہوں گے۔ نامی صاحب مولانا کے ماتحت اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ [ذکر فراہی، ص ۴۰، ۸۴۷] غامدی صاحب داڑھی کو سنت نہیں مانتے اور بیچ کی مانگ کو بدعت، اور فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں سنتوں کا مذاق اڑاتے ہوئے ایک مرتبہ میرے سوال کے جواب میں کہنے لگے کہ گھوڑے پر سواری کی جتنی سنتیں حدیث میں آئی ہیں ان پر عمل کرتے کرتے گھوڑا نکل جائے گا سوار رہ جائے گا یہ سب خرافات ہے فراہی صاحب سے تلمذ کا موقع نہ ملا ورنہ یہ اسرار ان پر کھول دیتا۔

مولانا فراہی فتویٰ دینے سے احتراز فرماتے تھے اور غامدی صاحب روز فتوے:

علم دین میں مجتہدانہ بصیرت رکھنے کے باوجود مولانا فراہی فتویٰ دینے سے احتراز کرتے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے مجھ سے بیان کیا۔

''مولانا حمید الدین سے کوئی فتویٰ پوچھتا تھا تو کہتے تھے کہ مدرسہ پر جائیں گے تو مولوی لوگوں سے پوچھ کر بتائیں گے''۔

مولانا ذمہ داری سے بچنے کے لیے ٹالتے تھے یا خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ فتویٰ دینا ایک فن ہے۔ علم کے ساتھ جب تک عملی تجربہ نہ ہو یہ فرض ادا نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا یقیناً اس کوچے سے ناآشنا تھے۔ ان کے علم، مطالعہ اور فکر کی سطح اور تھی۔ اسی لیے وہ مدرسہ کے مولویوں کو اپنے سے زیادہ اس کا اہل سمجھتے تھے۔ **غامدی صاحب تو مولویوں کو کسی قابل نہیں سمجھتے. بات بے بات فتویٰ دینے کے لیے تیار رہتے ہیں. ان کا خیال ہے کہ مولویوں کے مقابلے کے لیے مولوی بننا پڑے گا ورنہ عوام پھر مولوی کے ہتھے چڑھ جائیں گے. ایک زمانہ میں تو غامدی صاحب نے عوامی رابطے کے لیے خانقاہ کا بھی دینی جواز ثابت کر دیا تھا اور ان کے شاگرد ڈاکٹر فاروق خان نے اپنی کتاب میں جو المورد سے شائع ہوئی خانقاہ اور مربی کی ضرورت پر پندرہ صفحات لکھے تھے اور لکھا تھا کہ فی الحال اس طرح کا کوئی آدمی ہمیں دستیاب نہیں لیکن خانقاہ بہت ضروری ہے جو خاص طور پر خدمت خلق اور لوگوں کے مسائل کے حل کے لیے ہو غامدی صاحب کی تقریروں میں اس کی تائید موجود ہے۔**

فراہی صاحب مسئلہ بتانے سے احتراز غامدی صاحب ہر وقت تیار:

فراہیؒ صاحب کوئی دینی مسئلہ بھی نہیں بتاتے تھے۔ عبداللہ خان نے مجھ سے بیان کیا۔

ایک بار کا ذکر ہے میں نے مولانا سے کوئی مسئلہ پوچھا۔ مولانا نے کہا میں مفتی نہیں ہوں مجھ کو مسئلہ بتانے کا حق نہیں۔ اس کے بعد سب لوگ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد جانے لگے۔ میں نے موقع دیکھ کر اسی بات کو دوسرے انداز سے پوچھا کہ مولانا اگر آپ کو یہ صورت حال پیش آئے تو آپ کیا کریں گے۔ مولانا نے بتا دیا کہ میں یہ کروں گا۔ اس طرح مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

یہ نہیں معلوم کہ مسئلہ کیا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ روزہ نماز کا کوئی معمولی مسئلہ تھا جس سے ہر آدمی کو عملاً واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مولانا نے مسئلے کی صورت میں جواب دینے سے اجتناب کیا۔ معلوم ہوتا ہے مولانا جس طرح نماز پڑھانے سے بچتے تھے مسئلہ بتانے سے بھی کتراتے تھے اور اس کی وجہ احتیاط

اور ذمہ داری کا احساس ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا علم ناکافی تھا اور وہ مسائل کا استنباط نہیں کر سکتے تھے۔[ذکر فراہی،ص ۱۷۸]یہ اس شخص کا حال تھا جو جدید قدیم علوم کا جامع تھا جس کے بارے میں غامدی صاحب کا کہنا ہے کہ ایسا آدمی تاریخ میں پیدا نہیں ہوا یہ شخص غامدی کے الفاظ میں ائمہ اربعہ سے بڑا بلکہ صحابہ کرام کی صف کا آدمی تھا جو ان کے قافلے سے بچھڑ کر ہند میں وارد ہوا تھا اس قدر علم کے باوجود وہ دینی مسئلے بتانے کے بجائے مولویوں سے رجوع کرنے کی ہدایت کرتے تھے اور غامدی صاحب مولویوں کے دشمن ہیں انہیں برا بھلا کہتے ہیں اور فراہی صاحب کی روح کو کچوکے لگاتے ہیں.

فراہی صاحب اسراف سے اجتناب اور معاملات میں صفائی: غامدی صاحب اسراف کے عادی

مولانا امین اصلاحی نے مجھ سے بیان کیا۔

کفایت سادگی وصفائی ان کی زندگی کے نمایاں پہلو تھے۔ لین دین کے معاملات میں حد درجہ محتاط تھے۔ کسی سے کچھ لینے کی ضرورت تو شاید ہی زندگی میں کبھی ان کو پیش آئی ہو۔ دینے کے معاملے میں بڑے فیاض تھے اور آمدنی کا بیشتر حصہ اسی طرح کے کاموں میں صرف کر ڈالتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کی تعلیمی سرگرمیوں اور دوسرے رفاہی کاموں میں ان کے دست راست مولانا ہی تھے۔

کوئی غیر ضروری چیز جس کا تعلق اسراف سے ہو اس کا کوئی شائبہ ان کی زندگی میں نہیں تھا جو چیزیں ہوتی تھیں نہایت سلیقے اور قرینے کی ہوتی تھیں۔ زندگی میں بلا کسی تصنع اور اہتمام کے بڑی صفائی تھی۔ اس کے برعکس غامدی صاحب نے حال ہی میں ڈیفنس سوسائٹی میں نئی رہائش گاہ اختیار کی ہے جس کی مالیت پانچ کروڑ سے زیادہ ہے. نئی پجیرو، بلٹ پروف جیپ اور حفاظتی دستہ یہ چونچلے فراہی مکتب فکر میں نہ تھے. لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ غامدی صاحب اسٹار ٹکسٹائل والوں سے ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ لیتے ہیں فراہی صاحب نے مدرسے کو دیا کچھ نہ لیا، سادہ زندگی بسر کی غامدی صاحب کی زندگی تو بڑی شاہانہ ہے۔مولانا اصلاحی کی شہادت ہے کہ رئیس ہونے اور بھاری تنخواہ پانے کے باوجود زندگی نہایت سادہ تھی۔ مکان میں معمولی فرنیچر، کپڑے نہایت سادہ پہنتے، کھانے میں کسی تکلف کے عادی نہ تھے۔[ذکر فراہی،ص ۸۹۴] غامدی صاحب کا اس طرز عمل سے کیا تعلق؟ ان کے ہر حلقے کا ہر آدمی مغرا مجد، ساجد حمید، سلیم شہزاد، طالب محسن، خالد ظہیر، سمیع مفتی ایسے ٹھاٹھ باٹ اور شان وشوکت وتصنع سے رہتے ہیں کہ تصور نہیں کیا جا سکتا یہ دنیا دار لوگ سادگی کا ان سے کوئی تعلق

نہیں ان کا فراہی اور اصلاحی سے کیا تعلق معز امجد کا حال تو یہ ہے کہ درس حدیث و قرآن دیتے ہوئے سگریٹ پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ممانعت کہاں ہے غامدی صاحب کی طرح ہر بات میں کہتے ہیں کہ یہ فرض ہے نہ سنت میں نے ایک بار غامدی صاحب سے پوچھا کہ غامدی صاحب اپنے باپ کے جنازے میں شرکت اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کیا فرض ہے یا سنت ہے تو چپ ہو گئے میں نے پوچھا کیا وجہ ہے کہ ہر آدمی اور خود آپ بھی ایسے موقع پر لازماً شرکت کرتے ہیں آخر کیا ضرورت ہے جنازہ فرض کفایہ ہے گھر میں بیٹھے رہو خاندان کے لوگ دفن کر دیں گے بیٹی کی شادی میں شرکت نہ کرو دوسرے لوگ شرکت کر لیں گے لیکن کوئی ایسا بیٹا اور باپ تاریخ نے پیدا نہیں کیا جو اپنے باپ کے جنازے میں اور بیٹی کے نکاح میں شرکت نہ کرے اس بنیاد پر کہ نہ یہ فرض ہے نہ سنت۔ تو ہم ان امور کو فرض سے بڑھ کر کیوں انجام دیتے ہیں غامدی صاحب چپ ہو گئے۔

رہن سہن میں سادگی: غامدی صاحب اور شاگرد عیش و عشرت کے عادی

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

مولانا ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھنے اور بیش قرار تنخواہ پانے کے باوجود زندگی نہایت سادہ اور طالب علمانہ بسر کرتے تھے۔ مکان میں معمولی فرنیچر ہوتا، کپڑے نہایت سادہ پہنتے، کھانے میں بھی کسی تکلف کے عادی نہیں تھے۔ تنخواہ کا بیشتر حصہ یا تو کتابوں کی خرید اور ان کی پر تکلف جلدوں پر خرچ ہوتا تھا یا پھر مستحقین خصوصاً غریب اہل علم اور نادار شرفا کی امداد اور اس دوسری مد کا خرچ ان کے ہاں کافی وسیع ہوتا۔ غامدی صاحب کا ان امور سے کیا تعلق؟ غامدی صاحب غریب گھرانے کے فرد تھے۔ رئیس نہ تھے لیکن ان کے ٹھاٹ باٹ رئیسانہ ہیں ۱۹۸۸ء میں بھی وہ ایئر کنڈیشنڈ استعمال کرتے تھے۔ اسے آلہ تکلیف اپنی تحریر میں لکھتے تھے جب کہ فراہی صاحب خاندانی رئیس لیکن سادگی کے پیکر تھے۔

فراہی صاحب کا معیار زندگی اور غامدی کا معیار زندگی:

مولانا کی زندگی کے آخری پانچ چھ سال میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔ اس دور میں انھوں نے اپنی زندگی کا معیار تقریباً وہی بنا لیا تھا جو مدرسۃ الاصلاح [سرائے میر، اعظم گڑھ] کے غریب اساتذہ اور طلبہ کا تھا۔ ہمارے ہی ساتھ بیٹھ کر جو دال دلیا میسر آتا کھا لیتے، ہماری ہی طرح سادہ اور غریبانہ کپڑے پہنتے، ہمارے ہی ساتھ ٹاٹ پر بیٹھتے۔ ان کی باعظمت پیشانی اور ان کے نورانی چہرہ کے سوا اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے ایک اجنبی ہمارے درمیان ان کی بڑائی کا اندازہ کر سکتا اور یہ تو ان کو دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ علوم مشرقیہ اور علوم مغربیہ کا یہی وہ مجمع البحرین ہے جو مولانا شبلی نعمانی جیسے محقق کا مرجع استفادہ رہ چکا ہے۔ [ذکر فراہی، ۹۲۵]

مولانا فراہی کے ساتھ اصلاحی و غامدی مکتب فکر کا سلوک

ذکر فراہی میں شرف الدین اصلاحی کے انکشافات

شرف الدین اصلاحی

حمید الدین فراہی کی پہلی مستند سوانح ذکر فراہی کے نام سے ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے تحریر کی۔ اس سوانح کا جو حشر ہندوستان میں دائرہ حمیدیہ، حلقہ فراہی اور پاکستان میں حلقہ اصلاحی و غامدی نے مشترکہ طور پر کیا اس کی کہانی شرف الدین اصلاحی کے قلم سے ''تذکرہ فراہی'' کے ورق ورق پر درج ہے۔ یہ کتاب غامدی صاحب کے مکتبہ فکر کے ادارے ''دار التذکیر'' نے شائع کی ہے۔ اصلاحی صاحب اور غامدی صاحب فراہی صاحب کو اپنے مکتب فکر کا امام اور ائمہ سابقین کے مقابلے میں سب سے افضل و برتر مانتے ہیں لیکن اپنے اس محسن کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اس کا مختصر قصہ پڑھیے۔ اس قصے سے اصلاحی و غامدی مکتب فکر کی اخلاقیات اور احسان فراموشی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے اقتباسات ملاحظہ فرمایے۔

[۱] مولانا امین احسن اصلاحی کے بارے میں ان کے استاد بھائی اختر احسن اصلاحی نے کہا تھا کہ کوئی نہیں چاہتا کہ دنیا مولانا فراہی کو بھی جانے۔ یہی بات مجھے رہ رہ کر یہاں آتی ہے کوئی نہیں چاہتا کہ فراہی پروجیکٹ اتمام کو پہنچے۔ [ذکر فراہی، ص ۲۷، دار التذکیر لاہور]

[۲] ''ذکر فراہی'' دائرہ حمید بھوپال کو اشاعت کے لیے دی گئی تو ایک تہائی مواد مصنف کی اجازت کے بغیر خارج کر دیا گیا۔ کتابت املاء انشاء متن حروف بنی صوری و معنوی لحاظ سے کمتر لگتا ہے کہ کسی نے دیکھا ہی نہیں یا دیکھنے والے انتہائی نااہل اور غیر ذمہ دار لوگ تھے۔ سب کچھ دانستہ سازشی انداز میں کیا گیا اور پردہ ڈالنے کے لیے غلط بیانی اور ہیرا پھیری سے کام لیا گیا ورنہ پیش لفظ میں تدلیس ابلیس کا پرتو نظر نہ آیا۔ [ذکر فراہی، ص ۲۶]

[۳] دائرہ حمیدیہ نے ذکر فراہی کا ایڈیشن شائع کیا تو مصنف کی اجازت کے بغیر اتنے تصرفات کیے گئے کہ کتاب مسخ ہو کر رہ گئی۔ جہل مرکب میں مبتلا کسی نیم خواندہ ملائے مکتب نے زبان و بیان میں اصلاح و تصحیح کی بھی

کوشش کی ہے۔مولوی سعید ندوی کا نام تلامذہ میں شامل کرنے پر اعتراض کیا گیا جب کہ وہ فراہی کے شاگرد نہ تھے۔نجم الدین اصلاحی کا نام باب تلامذہ سے خارج کر دیا گیا۔مولانا مودودی کی ذیلی سرخی تبدیل کر کے کچھ کی کچھ کر دی گئی جس میں لفظی ومعنوی تعریف کا ارتکاب کر کے متن میں بھی ردوبدل کر دیا گیا۔[ذکر فراہی،ص۲۵]

[۴] فراہی کی سوانح کے سلسلے میں امین احسن اصلاحی پورے برصغیر میں واحد فرد تھے لیکن بوجوہ میں ان سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکا ان کے قائم کیے ہوئے حلقے اور ادارے ہی کسی کام نہ آئے اور نہ ان کے پڑھائے ہوئے شاگردوں میں سے پراجیکٹ کا کچھ بھلا ہوا اور آخر میں تو استاد[امین احسن اصلاحی ساحل] شاگرد[خالد مسعود، جاوید غامدی وغیرہ وغیرہ ساحل] سب نے آنکھیں پھیر لیں۔سب اجنبی ہو گئے، پراجیکٹ پر جب کڑا وقت آیا تو سب کے سب زیر زمین روپوش ہو گئے کہ میں کہیں کوئی سوال نہ کر بیٹھوں۔ پروجیکٹ تفویض ہوا تو ایک ڈھنڈورچی کے دفالی نے کہا۔مولانا اصلاحی کے ہاں سے ہر چیز بنی بنائی مل جائے گی لیکن مولانا اصلاحی یا ان کے کسی حلقہ بگوش کے ہاں سے فراہی کی مطبوعہ کوئی کتاب بھی نہ ملی۔[ذکر فراہی،ص۲۰]

[۵] مولانا فراہی کی زندگی میں ان کے پیچھے چور لگے مرنے کے بعد ان کی باقیات کے پیچھے بھی چور لگے رہے،فراہی پروجیکٹ شروع ہی سے چوروں اور چوریوں کا ہدف بنا رہا۔[ذکر فراہی،ص۱۱]

[۶] مولانا فراہی کی باقیات،ان کے افکار،ان کے خیالات،ان کی تحقیقات کس کس نے چوری کی اسکی تفصیلات ذکر فراہی کے مرتب نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں بیان کی ہے۔اس تفصیل کو آپ غامدی اصلاحی کے سرقوں پر مشتمل مضمون میں ملاحظہ فرمایے۔شرف الدین اصلاحی کے مطابق تدبر قرآن کے تمام اہم حصے حمید الدین فراہی کے ان حواشی پر مشتمل ہیں جو مولانا فراہی نے قرآن کے دو نسخوں پر لکھے تھے۔یہ حواشی چھ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔دائرہ حمیدیہ نے یہ نسخے اصلاحی صاحب کو عاریتاً دیے تھے۔تدبر شائع ہونے کے بعد جب یہ نسخے طلب کیے گئے تو اصلاحی صاحب نے یہ نسخے دینے سے انکار کر دیا۔ یہ نسخے ایک صندوق میں بند تھے جو مولانا اصلاحی کی چارپائی کے نیچے رہتا تھا۔ یہ بدتمیزی، بدنصیبی اور گستاخی کی انتہا ہے کہ قرآن کریم کے نسخے پلنگ کے نیچے رکھے جائیں۔یہ گستاخی، بے ادبی تمام جدیدیت پسندوں کا خاص وصف ہے۔یہی نہیں مولانا فراہی کے بعض مسودات غائب کر دیے گئے اور بعد میں خالد مسعود کے نام سے ان کے ترجمے شائع کیے گئے۔مولانا فراہی کی ''اسباق النحو'' جو سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب ہے اس کا سرقہ کر کے خالد مسعود نے اپنے نام سے شائع کر دیا اور اس سرقے کی تصدیق فرماتے ہوئے امین احسن اصلاحی نے اس پر دیباچہ بھی لکھا۔اس کتاب سے مولانا فراہی کا لکھا ہوا دیباچہ تک نکال دیا گیا۔فراہی صاحب نے قرآن وسنت کے جو اصول متعین کیے تھے اصلاحی صاحب اور غامدی نے ان اصولوں کو تسلیم نہ کیا۔فراہی صاحب ٹوپی، داڑھی، درمیان سے مانگ، تہمد۔ قربانی کو سنت قرار دیتے ہیں لیکن غامدی صاحب نے ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر حملے کے بعد یہ سنتیں بدل ڈالیں۔فراہی

صاحب نے تفسیر کا یہ اصول بیان کیا کہ قرآن کی ایک آیت کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں لیکن غامدی صاحب صرف پردہ سے متعلق قرآنی آیات کے ۲۰ سال میں ۲۵ مختلف مفاہیم متعین کر چکے ہیں۔

الاصلاح چار سال جاری رہ کر ۱۹۳۹ء کے آخر میں بند ہو گیا۔ امین احسن اصلاحی کے قلم سے مولانا فراہی کے مطبوعہ اجزائے تفسیر (عربی) کے اردو تراجموں کا سلسلہ اسی رسالے میں شروع کیا گیا۔ مصلحتاً ان تراجموں میں مولانا اصلاحی نے کچھ تصرفات بھی کیے۔ کہیں کہیں عبارت حذف کر دی گئی جس پر نکتہ چینیوں نے گرفت کی۔ غالباً اس کے بعد ہی مولانا اصلاحی نے مجموعہ تفاسیر فراہی کے دیباچہ میں اس کے ذکر یا وضاحت کی ضرورت محسوس کی۔ لکھتے ہیں:

''میں نے بھی ان کے ترجمہ میں دیانت داری کے خیال سے کچھ زیادہ تصرف نہیں کیا ہے، صرف مقدمہ اور تفسیر سورہ فاتحہ سے بعض ایسے حصے ترجمہ میں حذف کر دیے ہیں جو بالکل ہی ناتمام یادداشتوں کی شکل میں تھے ''الخ'' واقعی دیانت داری کا تقاضا یہی ہے۔ [ذکر فراہی، ص ۵۷۴]

بدرالدین اصلاحی نے مجھے بتایا کہ امین احسن اصلاحی کو خط لکھا گیا کہ فراہی کے مسودات کی اشاعت کی فکر کرنی چاہیے انہوں نے جواب میں یہ تجویز ارسال کی کہ مولانا فراہی کے مسودات کی اشاعت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا ان کو سمجھے گا کون۔ بہتر ہوگا کہ ان کے افکار کو سامنے رکھ کر اردو میں نئے سرے سے ایک تفسیر لکھ دی جائے۔ ان کا خط پڑھ کر اختر احسن نے آہ سرد بھری اور حسرت و یاس کے عالم میں کہا کہ کوئی نہیں چاہتا کہ دنیا فراہی کو بھی جانے۔ میں نے اس خط کے بارے میں بدرالدین صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ محفوظ نہیں رہا [ص ۵۷۶ ذکر فراہی]۔

اگرچہ میں اپنے فکر کو حضرت الاساتذ علیہ الرحمۃ کے فکر کے ساتھ ملانا بے ادبی خیال کرتا ہوں، لیکن چونکہ واقعہ یہی ہے کہ میں نے عمر بھر استاذ کے سُر میں اپنا سُر ملانے کی کوشش کی اور میرا فکر ان کے فکر کے قدرتی نتیجہ ہی کے طور پر ظہور میں آیا ہے۔ اس وجہ سے یہ جوڑ ملانے کی جسارت بھی کر رہا ہوں، اگر یہ بے ادبی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے۔ [ذکر فراہی، ص ۵۷۹] بے ادبی کی انتہا دیکھئے کہ قرآن کے علم کو سُر سے سُر ملانا کہا جا رہا ہے۔

''تدبر قرآن'' کو فراہی مکتب فکر کی نمائندہ تفسیر کہا جاتا ہے۔ تدبر قرآن لکھنے کے لیے امین احسن اصلاحی نے فراہی کی عربی تفسیر نظام القرآن کے مطبوعہ اجزا کے علاوہ تمام غیر مطبوعہ مسودات کی اصل کاپیاں دائرہ حمیدیہ (انڈیا) سے منگوالیں۔ قرآن مجید کے وہ نسخے منگوالیے جو مولانا فراہی کے زیر مطالعہ رہے اور جن پر ان کے حواشی اور نوٹس ہیں۔ ان حواشی کی کیفیت یہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کو الگ سے نقل کر رکھا ہے۔ اس کے مطابق وہ تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان تمام چیزوں کو اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر میں استعمال کیا۔ یہ تمام چیزیں دائرہ کی تحویل میں تھیں۔ اور دائرہ کی ملکیت تھیں۔ دائرہ کے قیام کا اولین مقصد ان غیر مطبوعہ باقیات کی حفاظت اور طباعت و اشاعت تھا۔ اس کام میں کوئی چاشنی نہ تھی۔ یہ ایک کڑوا گھونٹ تھا۔ اصلاحی صاحب کا کام

مکمل ہوگیا تو یہ مسودات واپس گئے۔مگر حواشی والے دونوں قرآن واپس کرنے سے امین احسن اصلاحی نے انکا رکر دیا۔واپسی کی کاروائی چونکہ میرے ذریعہ ہوئے اس لیے مجھے ان باتوں کا براہ راست علم ہے۔فراہی کے ہاتھ کے عربی مسودات میں سے بھی کچھ چیزیں واپس نہیں گئیں۔قرآن کے نسخے تو اصلاحی صاحب کے پاس ہیں مگر مسودات کے گم شدہ حصوں کا کچھ پتا نہیں چلا۔گم یا کم ہونے کا پتا اس لیے چلا کہ مولانا بدرالدین نے اپنے ہاتھ سے ان کی نقلیں تیار کر کے رکھ لی تھیں۔بدرالدین اصلاحی کا بیان ہے کہ گم شدہ اوراق کے ترجمے مولانا اصلاحی کے شاگرد خاص خالد مسعود کے قلم سے شائع ہوتے رہے۔یہ شاگرد خاص مولانا اصلاحی کی سرپرستی میں شائع ہونے والے رسالہ تدبر کے ایڈیٹر ہیں۔یہی خالد مسعود ہیں جنہوں نے مولانا فراہی کی سب سے کثیر الاشاعت کتاب اسباق الخوا اپنے نام سے چھاپ لی۔کتاب کا نام وہی ہے۔لیکن اس کے مصنف خالد مسعود ہیں۔جواز یہ پیش کیا گیا کہ کتاب میں جو کمی تھی وہ خالد مسعود صاحب نے پوری کر دی ہے۔[ذکر فراہی،ص۵۸۰]

واپس آ کر میں نے اس کا ذکر اصلاحی صاحب سے کیا اور ان سے پوچھا کہ آپ نے کچھ سوچا ہے۔انھوں نے خالد مسعود کا نام لیا۔گویا وہ نام زد خلیفہ ہیں۔لیکن چونکہ مولانا ابھی زندہ ہیں اس لئے بکس ابھی تک انہی کے کمرے میں ہے۔مولانا کی صحت جب زیادہ بگڑ گئی تو مجھے قرآن مجید کے ان دونسخوں کا خیال آیا۔میں نے خالد مسعود سے پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔پھر نعمان صاحب سے دریافت کیا تو یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ نسخے محفوظ ہیں اور وہ بکس مولانا اصلاحی کے کمرے میں ان کی چارپائی کے نیچے ہے۔[ذکر فراہی،ص۵۸۱] قرآن اور استاد کا ادب ملاحظہ کیجئے۔

مولانا بدرالدین نے مجھ سے بیان کیا کہ یہ ترجمہ چند سورتوں کا ہے اور اس میں جگہ جگہ بیاض چھوٹی ہوئی ہے۔سورۂ والنازعات غرقاً کے ترجمے میں قسموں کا حصہ مولانا نے نمبر لگا کر خالی چھوڑ دیا تھا۔اور وہ اصل مسودہ میں اسی طرح چھوٹا ہوا ہے۔لیکن کسی نے بعد میں اسے پر کر دیا۔کہاں سے کیا ہے یہ معلوم نہیں۔کسی کے لئے بھی یہ بات مناسب نہیں کہ بغیر نوٹ اور حاشیہ کے مولانا کے کسی کام میں اس قسم کا تصرف یا عمل پیوند کاری کرے۔مولوی بدرالدین صاحب نے بتایا کہ یہ کام دراصل عباد صاحب مرحوم نے کیا کہ وہی مسودات کی واپسی کا مطالبہ لے کر ان کے پاس آئے تھے اور وہی ترجمہ نقل کر کے لے گئے تھے۔جسے بعد میں اپنے لڑکے کے نام سے چھپوایا۔ترجمہ قرآن کے مطبوعہ نسخے میں دو جگہ مرتب کا یہ حاشیہ بھی لائق توجہ ہے کہ یہاں جگہ خالی تھی اور اسے مولانا امین اصلاحی کے ترجمہ سے پر کر دیا گیا ہے۔اس طرح کی ملاوٹ علمی اعتبار سے غلط روش ہے۔علمی دنیا میں اسی طرح کے کام کے طریقے مقرر ہیں۔اگر یہ روش چل نکلی تو فراہی کے سودے باز بچے اطفال بن جائیں گے۔[ذکر فراہی،ص۷۰۷]

مولانا اصلاحی کا تملق تکبر اور خود پسندی:

''مولانا فراہی ایک سر مخفی تھے، میں نے انہیں آشکارا کیا''۔

بین السطور معانی تک رسائی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ واقف حال اور محرم اسرار ہی اس جملے کی پہلوداری کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی جگہ اگر وہ یہ جملہ کہتے تو زیادہ حقیقت کے قریب اور حسب حال ہوتا۔ میں ایک بھٹکا ہوا راہی تھا فراہی نے مجھے راستے پر لگایا۔

ایک ملاقات میں کہا۔

میں نے ایک دھیلا خرچ کیے بغیر وہ کام کر دیا جس کے لیے ڈاکٹر حفیظ اللہ نے پچاس ہزار کا عطیہ دیا تھا۔ اب انہیں مجھ سے یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ میں نے کچھ نہ کیا۔ اور روز حشر مجھے ان سے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ جنہوں نے تفسیر تدبر قرآن پڑھی ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی محنت استاد کے کھاتے میں ڈال دی ہے۔ [تذکرہ فراہی، ص۵۸۲]

مشن جس کے لیے فراہی نے سید سلیمان ندوی کے بقول امین احسن کو تیار کیا تھا اور جس کی حقانیت اور برتری کے وہ دل سے قائل تھے۔ اس مشن کے لیے اس زمانے میں فراہی کے ایک عقیدت مند نے پچاس ہزار کی خطیر رقم کا عطیہ دیا تھا۔ اور وہ رقم اصلاحی صاحب کے نام ان کے ذاتی اکاونٹ میں جمع کر دی گئی تھی۔ اس وقت کے پچاس ہزار کی مالیت آج کے پچاس لاکھ کے برابر ہے۔ وہ رقم ہمیشہ کے لیے ڈوب گئی۔ در در رکھنے والوں نے ہزار جتن کیے کہ مولانا کسی طرح ایک بار آ جائیں رقم نکلوانے کے لیے فقط ایک دستخط کرنا تھا۔ وہ رقم ان کی بے اعتنائی کی وجہ سے ضائع گئی۔ مذکورہ بالا پچاس ہزار سے متعلق دستاویز کی نقل فوٹو اسٹیٹ کاپی اور ضروری معلومات موجود ہیں۔ یہ بات .....خلجان کا باعث بنتی ہے جب آدمی یکھتا ہے کہ پچاس ہزار کی رقم سے کوئی کام نہ کیا گیا اور اسے یوں ہی ضائع کیا گیا۔ فراہی کے دو ارشد تلامذہ میں سے امین احسن اصلاحی کو بعض ایسی خوبیوں سے بہرہ وافر ملا تھا جو اختر احسن میں نہیں تھیں۔ ان کے فراہی کے مدرسہ اور دائرہ کو چھوڑنے سے جو خلا پیدا ہوا وہ کسی طور پر نہ ہو سکا۔ [ذکر فراہی، ص۵۷۵]

درمیان میں مولانا فراہی کے اخلاف کو خیال آیا اور انہوں نے دائرہ حمیدیہ کے ناظم بدرالدین اصلاحی سے ترجمے کی نقل لے کر اپنی طرف سے شائع کیا چھوٹی تقطیع پر ۱۲۰ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ مرتب کی حیثیت سے اس پر ''ابن الحمید الفراہی'' کا نام ہے۔ میں نے قیاساً ابن الحمید کو محمد عباد صاحب پر محمول کیا۔ جو مولانا فراہی کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ دارالمصنفین کے ناظم ضیاء الدین اصلاحی نے بتایا کہ اس کا مصداق مولانا فراہی کے ایک پوتے حمد اللہ ہیں۔ طابع و ناشر کی حیثیت سے سرورق پر دائرہ حمیدیہ پھریہا اعظم گڑھ اور مکتبہ الحسنات رام پور یوپی کے نام درج کئے گئے ہیں۔ تحقیق پر بعض مناقشات کا علم ہوا جو افسوسناک اور تشویش انگیز ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء میں حذف و اضافہ کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا۔ مرتب کی حیثیت سے اس میں سرے سے کسی کا نام درج نہیں ہے۔ [ذکر فراہی، ص۷۰۶]

جہاں قرآن خاموش ہے وہاں سنت مرجع و ماخذ ہے: غامدی

میں حجیت حدیث اور وحی غیر متلو کا قائل ہوں

ماخذات دین قرآن، سنت ثابتہ اور حدیث

جناب جاوید غامدی ماخذ دین کے بارے میں فرماتے ہیں دین تین صورتوں میں ملا ہے [۱] قرآن [۲] سنت ثابتہ [۳] حدیث۔ سنت ثابتہ اور قرآن میں ثبوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں وہ جس طرح تواتر سے ملا ہے اسی طرح سنت عملی تواتر سے ثابت ہے چنانچہ اس بارے میں کسی بحث و نزاع کی گنجائش نہیں حدیث اگر قرآن، سنت، ثابتہ فطرت اور عقل کے مطابق ہو تو اس کی حجیت بھی مسلم ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ [غامدی ص ۱۶ اشراق جنوری ۱۹۹۴ء]

ماخذ دین کے بارے میں کم و بیش یہی موقف غامدی صاحب نے اشراق فروری ۱۹۹۴ء کے ص ۴۳ پر ام عبدالرب کے نام ایک خط میں اختیار کیا ہے۔ خط کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے کہ ''ماخذ دین کے بارے میں یہ میرا نقطۂ نظر ہے اس کے بعد میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے متعلق کسی اضطراب کے لئے کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔''

اشراق جون ۱۹۹۱ء میں ص ۲۱ پر غامدی صاحب کا ایک خط مورخہ ۲۱/اپریل ۱۹۸۹ء بنام استاد پروفیسر شیر محمد کے نام ہے [شیر محمد اختر صاحب رکن جماعت اسلامی تنظیم اساتذہ کے رہنما اور غامدی صاحب کے استاد رہ چکے تھے، ساحل] اس میں واضح طور پر غامدی صاحب فرماتے ہیں۔

داڑھی، ختنہ اور بے شمار دوسری چیزیں سنت ہیں: جاوید غامدی

سنت کو مستقل بالذات شارع مان کر دین میں شامل سمجھتا ہوں

اس طرح کے معاملات میں سنت کا انکار ضلالت ہے

حدیث کے بارے میں میرا نقطہ نظر غالباً پوری طرح واضح نہیں ہو سکا۔ رسالت مآبؐ کو میں صرف قرآن مجید کا شارح ہی نہیں مستقل بالذات شارع بھی مانتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے مضمون میں جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے بصراحت لکھا ہے۔ ''وہ امور جن میں قرآن مجید بالکل خاموش ہے اس طرح

کے معاملات میں سنت بجائے خود مرجع و ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے رجم کا معاملہ چونکہ دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے اس وجہ سے میں نے اس پر بحث کی اور عام رائے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے ورنہ داڑھی ختنہ اور اس طرح کی بے شمار دوسری چیزوں میں سنت کو مستقل بالذات شارع مان کر ہی دین میں شامل قرار دیتا ہوں۔ وحی غیر متلو کے وجود سے بھی مجھے انکار نہیں ہے قرآن جہاں خاموش ہے اور ہمیں کوئی حکم وہاں صرف سنت ہی کے ذریعے ملا ہے اس طرح کے معاملات میں سنت کو مستقل بالذات شارع مانتا ہوں اور اس کی اس حیثیت کے انکار کو بالکل ضلالت سمجھتا ہوں۔[اشراق جون ۱۹۹۱ء، ص ۲۱]

سنت ثابتہ، حدیث، حجیت حدیث، وحی متلو پر غامدی صاحب کا یہ موقف واضح کرتا ہے کہ ۱۹۹۵ء تک وہ مسلک جمہور سے قریب تر تھے لیکن رفتہ رفتہ انحراف کا عمل شروع ہوا۔ اس عمل کی بنیاد کیا تھی؟ انحراف کی دلیل کیا تھی؟ سنتوں کی نئی تعریف کے تعین کے اصول کیا تھے؟ غامدی صاحب کے اس ارتقاء کا ماخذ مصدر، منبع کیا تھا .....دین کہاں سے اخذ ہوگا، کیسے اخذ ہوگا، اخذ کرنے کے اصول کیا ہوں گے؟ کیا دین اخذ کرنے کے اصول ہر شخص وضع کر سکتا ہے اگر کر سکتا ہے تو اس کی دلیل کیا ہے اس دلیل کی تائید و توثیق کس اصول سے ہوگی ورنہ یہ بھی کشف کی طرح کا معاملہ ہوگا کہ کسی کو کشف ہو گیا ہے اور دلیل یہ ہے کہ مجھے ہوا ہے ان اصولوں کے تعین کے بغیر دین اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس اور فلسفہ بھی ایمانیات و الٰہیات پر ایمان لا کر جنھیں اصطلاح میں مفروضات کہا جاتا ہے۔ اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ لہٰذا سائنس، فلسفہ اور مذہب کے کچھ مسلمات اور ایمانیات ہیں۔ مثلاً خدا موجود ہے یہ ایمانیات کا حصہ ہے اس کے لیے کوئی قاطع دلیل نہیں دی جا سکتی۔ جتنے دلائل خدا کے وجود کے حق میں دیے جا سکتے ہیں اتنے ہی دلائل اس کے رد میں لائے جا سکتے ہیں مثلاً غامدی صاحب آج کل وجود خدا پر جو احمقانہ دلائل ٹی وی پر دے رہے ہیں یہ سب اٹھارہویں صدی کے فلسفے میں اٹھ چکے اور رد ہو چکے ہیں۔ ان احمقانہ دلائل سے فلسفے کا متبدی بخوبی واقف ہے۔ Designed Argument یعنی تخلیق کے وجود سے خالق کا وجود ثابت کرنا غامدی صاحب سے دو سو سال پہلے ولیم پیلے یہ کام کر چکا ہے اسے Telogolgical argument بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دلیل اسکاٹش فلسفے نے بھی استعمال کی ہے مگر فلسفے کی دنیا میں اسے Weekanalogy قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ غامدی صاحب جان ہک کی فلسفے کی ابتدائی کتاب Introduction fo Philosophy of Religion کا مطالعہ کر لیتے تو وجود خدا کے لئے اٹھارہویں صدی کی مسترد شدہ دلیلیں پیش نہ کرتے Designed Argument کو کانٹ نے اپنی کتاب Critique of Pure Reason میں علمی بنیادوں پر مسترد کر دیا ہے۔ کانٹ خدا کا قائل ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ ہم اس کے وجود کو دلائل سے اور حواس سے ثابت نہیں کر سکتے۔ کانٹ نے اپنی اسی کتاب کے باب Rational Theology میں غامدی صاحب کی احمقانہ دلیل کو دلائل سے مسترد کر دیا ہے۔

عام طور پر ٹی وی کے ناظرین اور بڑے بڑے مفکر اور عالم بھی فلسفے کے مبتدیانہ مباحث سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا غامدی صاحب پاکستانی لوگوں کی جہالت اور جاہلیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وجود خداوندی

پر اپنے جاہلی علم وفضل کے موتی ان کے سامنے بکھیر رہے ہیں اگر کوئی فلسفی ان کے سامنے موجود ہوتا تو صرف دس منٹ میں غامدی صاحب کے تمام احمقانہ دلائل فلسفیانہ اور منطقی بنیادوں پر مسترد کر دیتا اور غامدی صاحب کوئی جواب بھی نہ دے سکتے اصل سوال تو یہ ہے کہ خدا کو ماننے نہ ماننے کا مسئلہ کہاں پیدا ہوا ہے آج بھی دنیا کے ۹۸ فی صد لوگ خدا کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں خدا کو ماننا نہ ماننا مسئلہ ہی نہیں ہے امریکہ یورپ میں لوگ خدا کو مانتے ہیں پاکستان میں یہ مسئلہ کہاں سے پیدا ہو گیا ہنگٹنٹن نے اپنی کتاب "The Clash of Civilization" میں تمام اعداد وشمار دیے ہیں کہ دنیا میں کتنے لوگ خدا کو نہیں مانتے اصلاً غامدی صاحب اس سوال کی آڑ میں جدیدیت کو عام کرنے کے امریکی ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں یعنی وہ موضوعات جو معاشرے کا موضوع نہیں ہیں انہیں زبردستی اہم ترین موضوع بنا دیا جائے اس طرح کے سوالات کے ذریعے وہ ذہن تیار کیا جائے جو ہر مسلمہ فکر، مسلمہ قدر، مسلمہ نظریات، مسلمہ اصولوں، مسلمہ شخصیات کے بارے میں الٹے سیدھے سوالات شروع کر دے اور کسی ایسی ہستی کو باقی نہ رہنے دیا جائے جو ایمان کا حصہ ہو ہر ہستی سوال کی اقلیم میں لا کر ایک لاینحل سوال بنا کر اعتراضات کی بوچھار میں کھڑی کر دی جائے اور لوگوں کو بتایا جائے کہ اسے ترقی کہتے ہیں آزاد خیالی روشن خیالی یہ ہے کہ ہر موضوع پر بلا دھڑک بے تکان اظہار خیال کرتے جاؤ سوال پوچھتے جاؤ ایک ہیجان، خلجان، انتشار، اضطراب میں مبتلا رہو تا کہ اصل معاملات سے توجہ ہٹ کر بے کار معاملات میں الجھا دی جائے اور آخر کار ہر فرد خود کہہ دے کہ بھئی مذہب سے جان چھڑاؤ یہ تو عقل میں نہیں آتا لہٰذا عقل کی حکمرانی قائم کر کے تمام مسلمات Authorities کا انکار کر دیا جائے اور عقل کو ہی اصل ماخذ اصل منبع اصل مرجع سمجھا جائے جدیدیت کی مختصر لفظوں میں تعریف یہی ہے کہ وہ عقل کے سوا ہر مسلمہ مقتدرہ Authority کا انکار کرتی ہے اور عقل کو ہی خیرِ کل Absolute Truth سمجھتی ہے علم عقل سے شروع ہوتا ہے عقل پر ختم ہوتا ہے وہ علم علم نہیں جو عقل کے بجائے کسی خارجی ذریعے External Authority سے آئے لہٰذا وحی پر ایمان رکھنے والے جدیدیت پسندوں کی نظر میں احمق جاہل ہیں بلکہ انسان [Human] کہلانے کے مستحق نہیں ہیں اسی فلسفے کے تحت براعظم امریکہ میں ۹ کروڑ سرخ ہندی باشندوں کو پچاس سال میں قتل کر دیا گیا اسی فلسفے کے تحت آج کل دنیا میں مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے۔ غامدی صاحب کے ردی فلسفے سے یعنی گھڑی کے وجود سے گھڑی کے خالق کا وجود تو ثابت ہو گیا لیکن یہ کیسے ثابت ہوا کہ خالق آج بھی زندہ ہے گھڑی ساز کبھی نہ کبھی مر جاتا ہے۔ تاج محل کا وجود ہے خالق کا وجود کہاں ہے؟ یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ جو خالق ہے وہ حساب کتاب بھی کرے گا وہ ہمہ وقت ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے اسے کل علم حاصل ہے تمام طاقتوں کا مرکز اس کی ذات ہے وہ سراسر خیر ہے وہ ایک زندہ و بیدار ہستی ہے اور کائنات اور ہمارے اعمال اس کی نگاہ میں ہیں کیا خالق کو یہ معلوم تھا یا ہے کہ اس نے کیا تخلیق کیا ہے اور یہ تخلیق آئندہ کیا کرے گی اگر خالق سراسر خیر ہے تو کائنات میں شر کا وجود کیوں ہے؟ اگر وہ عادل اور خیر مطلق ہے تو کائنات میں رقص ابلیس اور قتل وخون پر

خاموش کیوں ہے یہ وہ سوالات ہیں جو ماضی میں اٹھے اور آئندہ بھی اٹھیں گے اور غامدی صاحب جیسے نادان طرف دارانِ خدا کے سرقہ شدہ فلسفے سے اٹھیں گے ظاہر ہے اسلامی منہاج میں رتو ان سوالوں کے جوابات مل سکتے ہیں لیکن غامدی صاحب کے بچگانہ منہاج میں ان سوالات کا جواب نہیں دیا جاسکتا یہی غامدی صاحب کے سرقہ شدہ طرز استدلال کی کم زوری ہے۔ جرمن سائنس داں نے Fatboy نیوکلیر بم بنایا وہ اس بم کا خالق تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ اس نے جو جوہری بم تخلیق کیا ہے یہ کیسی مخلوق ہے اسے معلوم نہ تھا کہ اس نے کیا بنایا ہے لہٰذا جب بم بن گیا اور اس کی تباہ کاری کا اندازہ ہوا تو اس نے کہا کہ ''آج کے بعد سے ہم سب جو اس کام میں شریک تھے وہ سب کتے کے بچے ہیں'' Cause اور Effect سے خدا کو ثابت کرنا ممکن نہیں ہے سینٹ انزلم اور آگسٹائن وغیرہ نے غامدی صاحب سے زیادہ مضبوط دلیلیں وجود خداوندی کے لئے دی تھیں اگر غامدی صاحب ان دلیلوں کو پڑھ لیتے تو یقیناً اور چہکتے لیکن وہ یاد رکھیں کہ ان مضبوط دلیلوں کو بھی فلسفے کی دنیا میں اس سے زیادہ مضبوط دلائل سے رد کر دیا گیا جو وجود خداوندی کے لیے دیے گئے تھے اس سلسلے میں Ontological argument بھی کام نہیں آسکا کیونکہ

Limits of Rationality is a limit of human mind

ایک محدود ذہن لامحدود ہستی کو ثابت نہیں کر سکتا لیکن اس پر ایمان، یقین، اعتقاد رکھ سکتا ہے جہاں عقل و ذہن ساتھ چھوڑ دیں وہاں انسان کی بے بسی کا اعلان ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی بے کسی کا اعتراف کر کے سجدے میں چلا جاتا ہے یا عقل کے حوالی سے ایمان کی آغوش میں بے تابانہ گر جاتا ہے اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ عقل کا مقام دل ہے اور اگر گوشت کا یہ لوتھڑا قلب، فواد، درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے یہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے این سلم نے Ontological argument میں دلیل یہ دی تھی کہ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا Perfect being ہے تو اس سے خود بخود ثابت ہو گیا کہ اس کا وجود بھی لازماً ہوگا ورنہ وہ Perfect نہیں ہو سکتا اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میری جیب میں ایک ہزار روپے کا نوٹ ہے اس کی تعریف بیان کر دے، خصوصیات، صفات، تجلیات بیان کر دے تو کیا اس تعریف بیان کرنے سے جیب میں ایک ہزار روپے کا نوٹ آجائے گا کسی چیز پر ایمان یا اس کی تعریف اس کے وجود کی دلیل نہیں بن سکتی کانٹ کی نظر میں وجود Property نہیں ہے دین کی کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہوتی غامدی اور اصلاحی کی کمزور ترین دلیل ہے یہ کہنا چاہیے کہ دین کی کوئی بات حکم رسول کے خلاف نہیں ہو سکتی اس لئے کہ دین وہ ہے جو رسول اللہ نے ہمیں بتایا ہے خواہ وہ ہماری محدود عقل میں نہ آسکے اور سائنس کے بے شمار نظریے، اصول آج بھی عقل تو کیا تجربہ گاہ میں بھی ثابت نہیں کئے جاسکتے ان پر ایمان لایا جاتا ہے تین ہزار سال تک نیپچون سائنسدانوں کی نظر میں [Planet] سیارہ تھا۔ لیکن ۲۰۰۶ء میں سائنس دانوں نے اسے نظام شمسی سے خارج کر دیا تین ہزار سال تک تمام حساب کتاب اس کو شامل کر کے کیا جاتا رہا تین ہزار سال کے تمام حساب کتاب غلط ہو گئے لیکن کسی ایک سائنس دان نے یہ نہیں کہا کہ ہمارا ایمان سائنس اور فلکیات سے اٹھ گیا ہے تو پھر دین پر عدم اعتماد اور ایمان اٹھنے کا سوال کیوں پیدا ہو رہا ہے اور پیدا ہو رہا ہے یا غامدی صاحب پیدا کر رہے ہیں؟